سلسلہ مطبوعات نمبر ۸۲

تعمیری انقلاب

اور

قرآنی اصولِ حکمت

از :-

حیدر زماں صدیقی

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

بار اوّل ـــــــــــــــــــ ۱۹۵۰ء

قیمت ـــــــ فی جلد ـــــــ دو روپے چار آنہ

شیخ نیاز احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس میں چھپوا کر کشمیری بازار لاہور
ـــــــ سے شائع کیا ـــــــ

فہرست

حامداً ومصلیاً

نگاہِ اوّلیں

سبوئے تازہ بر انگیزم از ولایتِ عشق
کہ در حرم خطرے از بغاوتِ خرد است

تہذیبِ حاضرہ نے انسانی ذہن کو اس درجہ زہرناک بنا دیا ہے کہ اسکی سمیت سے انسانیت کا ریشہ ریشہ مسموم ہو چکا ہے۔ دین و مذہب کا کوئی گوشہ، ہمہ گیر اصولِ انسانیت کی کوئی کڑی، اور آفاق گیر اقدارِ حیات کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو اسکے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ گیا ہو۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسانیت بسترِ مرگ پر دم توڑ رہی ہے۔ قلب و روح کی تمنائیں پامال ہو رہی ہیں۔ اقوامِ حاضرہ کی باہم بہیمانہ کشاکش نے انسانی آبادیوں کو جہنم زار بنا رکھا ہے۔ اور آج روئے زمین پر امن و سکون کی کوئی شعاع، راحت و طمانیت کی کوئی رمق، اور دیانت و صداقت کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔

سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک عالمِ انسانی کا یہ عالمگیر اضطراب محض خارجی اسباب و علل کا نتیجہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انکی توجہ حیاتِ اجتماعیہ کی بیرونی سطح پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ مگر اہلِ نظر کے نزدیک دورِ

تو محض راہ کی مشکلات کے خیال سے انسانیت کی اس سب سے بڑی خدمت سے دست بردار ہو جانا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ عصرِ حاضر کا انسان ہلاکت و تباہی کی راہ پہ گامزن ہے اسکو سنبھالنے کی کوشش نہ کرنا آخر کہاں کی دانشمندی ہے؟ حق یہ ہے کہ یہ ایک نہایت ذلیل اور شرمناک طرزِ عمل ہے۔ اور مردانِ راہِ حریت و عزیمت کی نظر میں اسکے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

گزشتہ دو ڈھائی سال سے جن لوگوں نے اپنی قوم کی انفرادی و اجتماعی سیرت کا جائزہ لیا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا ہر قدم کس جانب کو بڑھ رہا ہے۔ اور اس کی خطرناک اخلاقی پستی اسکو کس طرف لے جا رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو و فرنگی اپنے ذمائمِ اخلاق اس قوم کے حوالے کر گئے ہیں۔

از فرنگی می خرد لات و منات
مومن و اندیشۂ او سومنات

غرض اس مدت میں ہمنے جو کچھ دیکھا اور سنا ہے، اسکے تصور ہی سے جگر کانپ اٹھتا ہے۔ اور سر ندامت جھک جاتا ہے۔ ایسی تشویشناک حالت کو دیکھکر نگاہِ متجسس کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اسکے اسباب و داعیات کی ٹوہ لگائے۔ اور پھر اصلاحِ حال کی جو صورت ممکن ہو اس کو پیش کرے۔

یہ کتاب اسی ذہنی تاثر کی آئینہ دار ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

صدیقی

کامل اور صالح معاشرہ کا قرآنی تصور

ایک طرف عالم امروز کے حسین وجمیل منظر ہیں جو ہماری نگاہوں کو برابر دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔ اسکی نظر فریب رعنائیاں عنفوانِ شباب اور دلکش ادائیں تکمیلِ حسن کی شہادت دے رہی ہیں۔ مگر دوسری طرف زندگی کی پامال، مضمحل اور بے قرار تمنائیں ہیں جو اس ہنگامۂ ہستی کے گہوارۂ امن و راحت اور مرقعِ جمالِ معنوی بننے کے لئے مضطرب اور منتظر فردا ہیں۔ قلب کی ہر دھڑکن سے پتہ چلتا ہے کہ جو کچھ نظر آرہا ہے وہ محض فریبِ نگاہ ہے۔ اور جسکی طلب وجستجو ہے اس کا ابتک سراغ ہی نہیں ملا۔ قلب ونگاہ کی یہ آویزش اور حقیقت ومجاز کا یہ تضاد کیوں ہے؟ کیا سوچنے والوں نے کبھی اس مسئلہ پر بھی غور کیا ہے؟ دنیا کے وہ جلیل القدر ماہرِ عمرانیات اور بلند پایہ علماء سائنس جو زمین کے لاتعداد خزائن دریافت کرنے۔ عناصر کی خاصیتیں معلوم کرنے، اور انکی ترکیب سے نئے نئے اکتشافات کو بروئے کار لانے اور پھر آسمان کی بلندیوں تک رسائی حاصل کرنے میں اپنے علمی اور سائنسی کمالات کو عالم آشکار کر چکے ہیں۔ کیا وہ اتنی سی بات بھی نہیں بتا سکتے کہ تمہاری یہ

عجوبہ کاریاں جو نگاہوں سے خراجِ تحسین پا چکی ہیں، دلوں کے ویرانوں کو آباد کرنے میں کیوں ناکام رہی ہیں؟

عشق ناپید خرد می گزدش صورتِ مار ۔۔۔ عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ۔۔۔ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

کائنات کی اصل کیا ہے۔ زندگی کے تقاضے کیا ہیں۔ اور زندگی کا حقیقی ارتقار کیا ہے؟ یہ وہ مسائل ہیں جو آج تک اربابِ حکمت وفلسفہ کا موضوعِ بحث بنے رہے ہیں۔ اور جب تک کائنات کا نظام قائم ہے، آئندہ بھی یہ مسائل مرکزِ توجہ بنے رہینگے۔ مگر زندگی ایک انتھاہ سمندر ہے جسکی گہرائیوں کو ابتک نہ کوئی پا سکا ہے اور نہ آئندہ پا سکے گا۔

بہت دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ارتقارِ تمدن کے مسئلہ ہی کو لیجئے خود ارتقار کا مفہوم کیا ہے، اور ارتقارِ تمدن کا بنیادی تصوّر کیا ہے؟ سیکڑوں علما و مفکّرین نے اپنے اپنے مخصوص اندازِ فکر سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ افلاطون اور ارسطو ہوں یا روسو اور کارل مارکس سب نے اس عجیب وغریب اور پیچ در پیچ عقدۂ زندگی کو حل کرنا چاہا لیکن ان کی پیہم کوششوں کے باوجود اصل مسئلہ پہلے سے زیادہ اُلجھتا چلا گیا۔

ما کلٌّ من شمَّ نالَ دا تحتہٗ ۔۔۔ للناسِ فی ذا تباینٌ عجبٗ

ہیگل جیسا شہرۂ آفاق فلسفی مدتوں اس لیلائے مقصود کی تلاش میں دشتِ جنوں کی خاک چھانتا پھرا، اور گلشنِ ہستی کے مرجھائے ہوئے پودوں

کو خونِ جگر دے دیکر سینچا کیا۔ لیکن اس کی انتھک محنت اور مسلسل دماغی کاوش نظریۂ جدلیّت پر پہنچ کر رک گئی۔ یعنی اس نے اس نئے انداز میں مسئلہ ارتقا کی توجیہہ کی۔ کہ ہر موجود تصوّر سے ایک نیا صالح تصوّر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے جو پہلے تصوّر کی ضد ہوتا ہے۔ مگر یہ جدید تصوّر پہلے تصوّر کے مفید اور صالح اجزا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اسکے فاسد ناکارہ اجزا کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہ سلسلۂ ارتقا ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہاں تک آخیر میں ایک تصوّرِ مطلق (جو ہر دور کے صالح اور کارآمد اجزا کے مجموعہ سے عبارت ہے) معرضِ وجود میں آئے گا۔

نظریۂ جدلیّت کے اختراع سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ بس اب جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اور جس مسئلہ کو حل کرنے میں ہزاروں مفکرین کی دماغی کوششیں ناکام رہی ہیں اب وہ بالکل حل ہو گیا۔ اور کارل مارکس کے نزدیک بھی اسی طرح کی ارتقائی حرکت نظامِ تمدن و معیشت میں جاری رہتی ہے اور اس سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی اسکے نزدیک کامل معاشرہ یا مثالی سوسائٹی ہے مگر ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ ان حضرات نے مسئلہ ارتقا کی جو توجیہہ کی ہے، وہ بذاتِ خود ایک چیستان ہے۔ واقعات وحقائق کی روشنی میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو نیا تصوّر اجتماع یا نظامِ تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے۔ وہ پہلے عیوب و مفاسد کے علاوہ صدہا نئے امراض و اسقام اپنے ہمراہ لاتا ہے۔ جس سے ہم حتمی طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ اس دنیا میں ہیگل کے تصوّرِ مطلق کے لئے کوئی گنجائش ہے اور نہ کارل مارکس کی مثالی سوسائٹی کے لئے کوئی جگہ ہے۔

اگر کسی خطۂ ارضی میں کسی فوق الفطرت ہستی کی مقدس جدوجہد سے فاسد معاشرہ میں صالح انقلاب رونما ہوتا ہے تو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پاتا کہ نئے سرے سے شروفساد کی طاغوتی قوتیں معاشرے کے اندر ہی سے اُبھر آتی ہیں۔ جو اسکو فساد و تخریب کے اُسی موقف پر کھڑا کر دیتی ہیں۔ جس پر وہ پہلے تھا۔ بلکہ اکثر و بیشتر حالات میں بعد کی حالت پہلی حالت سے زیادہ فاسد اور پُرخطر ہوتی ہے۔ ان قطعی حقائق کے پیش نظر ہر وہ شخص جسکو خدا نے تھوڑی سی بھی بصیرت عطا کی ہے وہ بڑی آسانی سے اس بات کو تسلیم کریگا کہ ان مفکرین نے ارتقاء تمدن کی جو توجیہات کی ہیں وہ ناقص ہی نہیں بلکہ سراپا غلط اور خلافِ واقعہ ہیں۔

ہاں کارل مارکس اور لینن کی خدائی کو ماننے والے لوگ یقیناً کہیں گے کہ بھائی! آج دنیا کے ایک بڑے حصہ (سوویٹ یونین) میں ارتقائی معاشرہ کی ایک مثال موجود ہے۔ اور کارل مارکس کی روح دنیا کے دوسرے خداؤں کو چیلنج کر رہی ہے کہ " ہل من خالق غیری "؟

بات یہ ہے کہ ہمیں اس معاشرہ کو ارتقائی معاشرہ کہنے میں کوئی تامل نہ ہوتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس "ارتقائی معاشرہ" اور پہلے کے "غیر ترقی یافتہ" معاشرہ میں اگر کوئی فرق ہے تو بس اتنا ہی ہے کہ پہلے لاقانونی۔ اور غیر جمہوری طریقوں سے انسانیت کو ذبح کیا جاتا تھا۔ اور اب قانون اور جمہوریت کے نام سے اخلاق و شرافت کو رسوا اور انسانیت کو پامال کیا جا رہا ہے۔

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہوا اقوام کی معاش

ہمیں خوب معلوم ہے کہ اشتراکی ڈکٹیٹر شپ نے خود ساختہ اصول و تصورات (مارکسزم) کے نام سے جس طرح کروڑوں ناکردہ گناہ انسانوں کو تختۂ دار پر لٹکایا اور لاکھوں کو جلاوطن کیا اسکی مثال پہلے کے کسی بدترین دورِ استبداد میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ان لوگوں کا جرم صرف اتنا ہی تھا کہ یہ لوگ کارل مارکس کی الوہیت پر ایمان نہ لاسکے تھے۔ یا ان کی نسبت یہ شبہ تھا کہ وہ اندر سے منافق ہیں۔ اور آج بھی کروڑوں کی اس وسیع و عریض آبادی میں چند اشتراکی بھیڑیوں کے سوا کسی کی جان محفوظ نہیں ہے۔ اور ہر باشندۂ ملک کی موت و حیات موجودہ مطلق العنان ڈکٹیٹر شپ کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ ؎

اے وائے بہائے اگر این ہست بہار

ہاں اگر اشتراکیوں کے نزدیک ارتقائی معاشرہ کا مفہوم بس اتنا ہی ہے کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کر روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا میسر ہو تو ان معنوں کے لحاظ سے وہ اپنے دعویٰ میں حق بجانب قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ لیکن ہم جس معاشرہ کو ارتقائی معاشرہ کہتے ہیں۔ اس کا معیار ارتقاء اس سے بالکل مختلف ہے۔

رَاحَتْ مُشَرِّقَةً وَرُحْتُ مُغَرِّبًا
شَتَّانَ بَیْنَ مُشَرِّقٍ وَمُغَرِّبِ

حضرت امام ولی اللہؒ نے "ملت قصوی" کا تصور پیش کیا ہے لیکن لیکن ان کے نزدیک یہ ممکن الوقوع نہیں ہے۔ وہ خود ہی "بدور بازغہ" میں لکھتے ہیں کہ ملت قصوی کے تصور سے مقصود صرف اتنا ہے کہ اسکو مثالی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور اسکو سامنے رکھکر آگے بڑھنے اور زیادہ سے زیادہ اس سے مناسبت پیدا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ملت قصوی خارج میں اسوقت متحقق ہو سکتی ہیں، جبکہ معاشرہ کے تمام افراد تقویٰ وطہارت اور سیرت واخلاق کے اعلیٰ وارفع مقام پر پہنچ جائیں، مگر ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔

قرآنی تصورِ ارتقاء

متذکرہ بالا توضیحات سے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج تک دنیا کے اعاظم اہل علم ودانش اور شہرۂ آفاق اربابِ فکر عقدۂ زندگی کو حل کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں اور انہوں نے ارتقاء انسانیت کی جو سمت متعین کی ہے۔ وہ درحقیقت ہلاکت وبربادی کی سمت ہے۔ تو کیا فی الواقع کوئی ایسا تصورِ ارتقاء موجود ہی نہیں ہے جو بھٹکے ہوئے انسانوں کا رخ انسانیت کی حقیقی منزلِ مقصود کی طرف پھیر سکے؟ یہی وہ بنیادی مسئلہ ہے، جو اس وقت کاوشِ فکر ونظر کا محتاج ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے شعور نظری کی مدد سے ہمیں اس مسئلہ کا حل دریافت کرنا پڑیگا۔ کہ کیا انسانی زندگی کو راہِ عدل پر چلانے کے لئے کوئی ایسے دائمی اور ابدی اصول ونظریات اور مستقل اقدار بھی ہیں جن پر

زمانہ اور احوال و ظروف کی تبدیلی اثر انداز نہ ہوتی ہو۔ یا یہ کہ انسان کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ میں اپنے حالات اور ماحول کے مطابق جس طرح چاہے خود زندگی کے اصول و قوانین وضع کرتا پھرے؟

ہم بدیہی طور پر اتنا جانتے ہیں کہ حیاتِ انسانی کائناتِ عالم کا ایک حصّہ ہے (محض حصّہ ہی نہیں بلکہ جسمِ کائنات کا عضو رئیس ہے) اور اس حیثیت سے یہ کائنات کی دوسری چیزوں سے بے نیاز نہیں ہے بلکہ ہر چیز سے کسی نہ کسی رنگ میں رابطہ و تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام اجزاء عالم کے باہم ربط و تعلق سے کائنات کا نظام قائم ہے۔ جس طرح کہ ایک مشین کے تمام پرزے باہمدگر مربوط ہوتے ہیں اور ان کے باہم تعاون سے مشین حرکت کرتی ہے۔ اس بنا پر انسانی زندگی سے متعلق جب ہم کچھ سوچنے لگیں گے تو ہماری نگاہ صرف انسان تک ہی محدود نہیں رہیگی، بلکہ کائنات سے اسکو جو نسبت ہے اسکو بہر حال ملحوظ رکھنا پڑیگا۔ اور اس طرح کائنات کی دوسری چیزوں سے متعلق بحث کرتے وقت انسان کی ہستی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کائنات کی دوسری چیزوں کے متعلق ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان میں کچھ ایسے ازلی و ابدی قوانین کارفرما ہیں جو ہمہ وقت مصروف کار رہتے ہیں۔ اور زمانہ یا ماحول ان پر قطعًا اثر انداز نہیں ہوتا۔ جب سے انسان پیدا ہوا ہے وہ یہی دیکھتا چلا آیا ہے کہ سورج اور چاند اپنے معمول کے مطابق طلوع اور غروب ہوتے ہیں۔ دن اور رات حسبِ دستور گھٹتے اور بڑھتے ہیں۔ رات اپنے ساتھ گھٹا ٹوپ تاریکی لاتی ہے۔ اور دن اپنی ضیا پاشیوں سے پہچانا

جاتا ہے۔ غرض اس طرح کائنات کی ہر چیز نظم اور قانون کی پابند ہے اور اس سے ہم یہی سمجھ سکتے ہیں کہ جو قوانین اس نظام کو چلا رہے ہیں وہ مستقل اور غیر متبدل ہیں۔

(انسان جب اس کائنات کا اہم جزو ہے تو اسکے متعلق ہم یہ کیسے تسلیم کرلیں کہ اسکی زندگی کو ایک ڈھب پر چلانے کے لئے اس طرح کے ازلی، اور ابدی قوانین سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہمارا شعور، نظری اور وجدان اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ جب کائنات کی ہر چیز کو اسکی طبیعت اور فطرت کے مناسب قوانین دیئے گئے ہیں جن سے وہ اپنی ہستی کے توازن کو برقرار رکھتی ہے تو انسان کے لئے بھی یقیناً ایسے قوانین کی ضرورت ہے جن سے وہ اپنی زندگی کو ناہمواریوں اور اختلال و فساد سے محفوظ رکھ سکے یا ایک معین رفتار سے زندگی کی ارتقائی حرکت کو جاری رکھ سکے۔)

ہاں! اتنا فرق ضرور ہے کہ انسان کے علاوہ دوسری چیزیں عقل و فہم اور قدرت و اختیار سے محروم ہیں۔ اور وہ مجبور ہیں کہ ان ازلی قوانین کی پابندی کریں۔ لیکن انسان کو صاحبِ عقل و ہوش اور با اختیار بنایا گیا ہے اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی قدرت رکھتا ہے مگر جہاں تک خلاف ورزی کے انجام اور نتائج و عواقب کا تعلق ہے۔ اس میں یہ بھی مجبور و بے بس ہے۔ جب وہ خلافِ فطرت اعمال کا ارتکاب کرتا ہے تو اسکو لازماً تباہ کن نتائج سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ انسانی قوانین کا ایک حصہ ایسا بھی ہے۔

جن میں انسان کی قدرت و اختیار کو دخل نہیں ہے ان میں وہ اسی طرح مجبور ہے جس طرح کہ کائنات کی دوسری چیزیں ہیں۔ مثلاً موت کا طاری ہونا یسونے اور جاگنے کی خواہش۔ کھانے پینے کی احتیاج اور اس قسم کے دوسرے اُمور۔ اس سے بھی یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ انسانی زندگی کے دوسرے حصّہ (اختیاری حصّہ) کے لئے بھی ایسے ابدی اور مستقل اُصول و قوانین ہونے چاہئیں جو اسکو صحیح راہ پر چلا سکیں۔

بہرحال انسان اور دیگر اجزاء عالم کے باہم تعلق کی بنا پر قرآنِ حکیم بارہا انسانوں کو مظاہرِ کائنات میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے کبھی نظامِ فلکی کے ہوشربا مناظر اور اسکے حیرت انگیز نظم و تسلسل سے بحث کرتا ہے کبھی ریاح و سحاب (ہوا اور بادل) کی طبعی اور فطری عجوبہ زایوں کو کمال فصاحت و بلاغت سے بیان کرتا ہے۔ کبھی دن اور رات کے تعاقب اور ایک متعین اسلوب سے ان کے گھٹنے بڑھنے کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے۔ اور کبھی عالمِ نباتات کے غیر متبدل اسلوبِ ارتقاء کی توضیح کرتا ہے۔ تاکہ انسان اِن عناصرِ کائنات میں غور کرنے سے یہ بات سمجھ لے کہ جس طرح یہ چیزیں ایک متعین اور طے شدہ نظام کے تحت ہر لمحہ رواں دواں رہتی ہیں، اور اس وسیع سلسلۂ کائنات کی کسی ایک کڑی میں خلل و فساد رونما ہونے سے نظامِ کائنات درہم برہم ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے جو دائمی اصول اور مستقل اقدار دی گئی ہیں۔ ان پر عمل کر کے وہ پُرامن مسرّت بداماں اور متوازن معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہے۔ اور ان اصول و

قوانین سے انحراف کی صورت میں اسکو دائمی شورش، مسلسل اضطراب اور جاں گسل مصائب و آلام کے جہنم میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ (البقرہ)

(پس اگر آئے گا تمہارے پاس میری طرف سے قانونِ ہدایت، تو جس شخص نے اس قانون کی پیروی کی، اسکو کوئی خوف نہیں ہے اور نہ وہ غمگین ہوگا۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا ان کو جہنم کا عذاب دیا جائیگا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔)

اور قرآنِ حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے کہ ان اصول و قوانین کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے اس زندگی اور بعد کی زندگی میں ایک ہی جیسا سلوک نہیں ہوگا۔

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ (القلم)

کیا ہم ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے ایک ہی سلوک کرینگے۔ تعجب ہے کہ تم کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

یہاں تک ہم اتنا ہی معلوم کر سکے ہیں کہ حیاتِ انسانی کا توازن قائم رکھنے اور اسکو صحیح راستہ پر چلانے کے لئے کچھ ابدی اصول و قوانین موجود ہیں۔ لیکن یہ بات ابھی غور طلب ہے کہ ان ابدی اصول و قوانین کو ہم کیسے دریافت کر سکتے ہیں۔ اور ان کو معلوم کرنے کا ہمارے پاس کون سا ذریعہ ہے؟

بات یہ ہے کہ وہ غیر محسوس قوت جو اس کائنات کی روح ہے اور جس نے نظام عالم کو ایک متعین اور مقررہ نہج و اسلوب پر چلانے کے لئے اصول وقوانین وضع کئے ہیں۔ اُسی نے انسانوں کو راہ عدل پر چلانے، اور ضلالت و گمراہی سے بچانے کا اس طرح اہتمام کیا ہے۔ کہ وہ ہر زمانہ میں کچھ پاکیزہ اور معصوم ہستیوں کے ذریعہ انسانوں کو اپنا پیغام سناتی رہی ہے۔ یہ مقدس ہستیاں ہر زمانہ اور ہر ملک میں آتی رہیں اور وہ کمال صداقت ودیانت سے پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیتی رہی ہیں) ہر دوسرے پیغمبر نے وہی کچھ کہا، جو پہلا پیغمبر کہہ گیا تھا۔ یعنی پہلے اور دوسرے پیغمبر کے درمیان اگرچہ کئی کئی صدیوں کا زمانہ حائل تھا۔ مگر جو بات پہلے نبی نے کہی تھی ہو بہو وہی بات دوسرے نبی نے کہی۔ اور ہر دوسرا نبی پہلے نبی کی تصدیق کرتا رہا یہاں تک کہ ان لوگوں کی تعداد ہزاروں اور لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اور سب سے آخری نبی وہی بات کہتا ہے، جو سب سے پہلے نبی نے کہی تھی۔ اس سے ہر عقلمند انسان اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ یہ بات کسی ایک ہی پُر اسرار شخصیت کی ہے۔ جو ہر زمانہ میں مختلف زبانوں سے سُنی جا رہی ہے۔

اور یہی وہ دائمی اور مستقل اُصولِ حیات ہیں جو ان برگزیدہ ہستیوں کے ذریعہ انسانوں کو دیئے گئے ہیں۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ	بے شک ہمنے اپنے رسول آیات بینات
وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ	کے ساتھ بھیجے۔ اور انکے ہمراہ کتاب اور میزان
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید)	اتاری تاکہ لوگ راہِ اعتدال پر کھڑے ہو جائیں۔

ان تصریحات کے پیشِ نظر جب ہم انسانی تمدن کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اسکی تہ میں دو قسم کے تصورات کارفرما نظر آتے ہیں۔ ایک قسم تصورات کی وہ ہے جس کا ابھی ذکر ہوا ہے۔ اور دوسری قسم اُن تصورات کی ہے، جو ہر زمانہ میں خود انسان اپنے نفع عاجل اور مفاداتِ جزئیہ کے لئے وضع کرتا چلا آیا ہے۔ قسم اول کے تصورات ازلی اور دوامی ہونے کے علاوہ عالمی اور ہمہ گیر حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان کی افادیت زمان و مکان یا کسی خاص انسانی طبقہ سے مخصوص نہیں ہے لہذا ان اصول و تصورات پر جس معاشرہ کی بنیادیں اُٹھائی جائیں گی وہ لامحالہ ان تمام خصائص و کمالات کا حامل ہوگا جو کسی صالح اور ارتقائی معاشرہ میں ہونے چاہئیں۔ اس میں ہمہ گیر امن ہوگا۔ اخوت و مساوات ہوگی۔ خوشحالی ہوگی۔ انسانیت کی بے لوث خدمت کا جذبہ ہوگا۔ معاشرہ کے افراد میں باہم تعاون کی پُرخلوص روح کارفرما ہوگی۔ عصمت و پاکبازی ہوگی۔ دیانت و صداقت ہوگی۔ اور محبت کی فراوانی ہوگی۔

ایسے معاشرہ کی تعمیر یقیناً دقت طلب اور شدید مشکل ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ انسانیت کی انتہائی منزل یہی ہے۔ اور اسکے سوا مسرتِ دائمی عیشِ مسلسل اور حقیقی فلاح کا حصول کسی شکل میں ممکن نہیں ہے اور قرآنِ حکیم اسی مقصودِ انسانیت کو "العاقبہ" یا "الآخرہ" سے تعبیر کرتا ہے۔

دوسری قسم کے تصورات چونکہ مفاد پرستی اور اغراضِ عاجلہ پر مبنی ہیں۔ اس وجہ سے ان تصورات سے جس معاشرہ کی تعمیر ہوگی، اس میں قدرتی طور پر

بدامنی، شورش و اضطراب، بغض و عناد، وحشت و بہیمیت، خود غرضانہ عزائم، مکروفریب، فسق و معصیت، غصب و نہب، قتل و سفاکی، رشوت و بددیانتی اور اس قسم کے تمام مفاسد اجتماعیہ موجود ہونگے۔ قرآن حکیم نے ان تصورات کو "العاجلہ" سے موسوم کیا ہے۔ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۔ (آیہ)

پہلی قسم کا انسانی تمدن جو مستقل اقدار اور لازمانی تصورات پر مبنی ہے۔ چونکہ عین مقصود انسانیت ہے۔ اور تمام انسانی مطالبات کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لئے اسکو لازمی طور پر دوام و استقرار حاصل ہونا چاہئیے۔ اور دوسری قسم کا تمدن جو عارضی و وقتی اغراض و مصالح پر مبنی ہے۔ چونکہ شر و فساد کا سرچشمہ ہے اسلئے اسکو کبھی ثبات و استقلال نہیں حاصل ہو سکتا۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ِۨاجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ

آپ نے غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ کلمہ کی یوں مثال بیان کی ہے۔ کہ وہ پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ زمین میں مضبوطی سے گڑی ہوئی ہو اور اسکی شاخیں بلندی میں پھیلی ہوں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر حالت میں پھل لاتا ہو اللہ تعالیٰ اسی طرح انسانوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ اور ناپاک کلمہ کی مثال ناپاک درخت

الْاَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ | جیسی ہے۔ جسکو زمین کے اوپر سے اُکھاڑ دیا جائے۔ اسکے لئے ثبات و قرار نہ ہو۔
يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ۔ (سورۂ ابراہیم) | اللہ تعالیٰ ثابت قدم رکھتا ہے ایمان والوں کو قولِ ثابت (محکم بات) کے ذریعہ دنیاوی زندگی اور آخرت میں اور وہ ظالم و غلط کار لوگوں کو گمراہی کے گڑھے میں پھینکتا ہے۔

پاکیزہ اور صالح زمین کا رآمد سبزہ اُگاتی ہے۔ جس سے مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ مگر ناپاک اور ناقص زمین سے بے کار اور گھٹیا چیزیں اُگتی ہیں جن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا۔ (الاعراف)

اور یہ بات ہمیشہ سے مسلّم چلی آتی ہے۔ کہ جو چیز حسن و موزونیت مضبوطی، استحکام اور افادہ کے جوہر اپنے اندر رکھتی ہے۔ دنیا میں بقا و ثبات اسی کے لئے ہے۔ اور جو ان محاسن سے محروم رہے اسکے لئے کارگہہ عالم میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا | خدا نے آسمان سے پانی اتارا پس بہنے لگے نالے اپنے اپنے اندازہ سے پس اُٹھا لئے نالہ نے جھاگ اُبھرے ہوئے اور اس چیز

وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَ الْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ۔

(الرعد)

(سونے) سے جسکو زیور یا کوئی دوسرا سامان بنانے کے لئے آگ پر جلاتے ہیں ایسے ہی جھاگ اٹھتے ہیں اللہ تعالیٰ حق اور باطل کی اسی طرح مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ یوں ہی خشک ہوکر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور جو چیز لوگوں کو فائدہ پہنچانے والی ہے وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اسی طرح مثالیں بیان کرتا ہے

تعمیری انقلاب

آج دنیا میں صرف ایک ہی انسانی جماعت ان ہمہ گیر تصورات اور مستقل اقدارِ حیات کو ماننے والی ہے جسے قرآن حکیم نے "امتِ مسلمہ" کا خطاب دیا ہے۔ یہ وہی جماعت ہے جس نے آج سے تیرہ سو سال قبل انسانی معاشرہ میں حیرت انگیز اور بے مثال صالح انقلاب پیدا کیا تھا۔ اور ایک جدید نظامِ تمدن کے قیام و نفاذ سے دنیائے انسانیت پر زندگی کی راہیں کھول دی تھیں۔ یہ صالح نظامِ اجتماع اگرچہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں حریت و مساوات کی جو آوازیں گونج رہی ہیں، وہ اسی کی صدائے بازگشت ہیں۔ ؎

شمّۂ از داستانِ عشق شور انگیز ماست
آں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

اور عصر حاضر کا انسان اس تابناک مثال کو سامنے رکھ کر ہی آگے کی طرف قدم بڑھا سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہ جماعت جو دنیا کی قیادت و امامت اور انسانوں کو نئی زندگی اور نئے تمدن سے روشناس کرانے کے لئے معرضِ وجود میں آئی تھی آج وہ خود ہی اپنے صحیح مقام کو چھوڑ چکی ہے۔ بلکہ وہ اپنے حقیقی مقصد سے اس قدر دور ہٹ چکی ہے کہ اب اس میں اور دوسروں میں صرف ظواہر و رسوم ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔ ؎

چہ گویمت ز مسلمان نا مسلمانے
جز ایں کہ پور خلیل است آذری داند

آج اسکی اجتماعی سیرت اور ملی تہذیب سراپا بدل چکی ہے۔ اس کے عمل و کردار، اسکے اخلاق، اسکی معاشرت اور اسکی معیشت و سیاست کو دیکھکر آج کسی کو یقین ہی نہیں آ سکتا کہ یہ وہی ملت ہے جس نے دنیائے انسانیت میں وہ عظیم الشان اخلاقی، سیاسی اور تمدنی انقلاب بپا کیا تھا۔ جس کی یاد آج تک اہلِ دانش و بصیرت کے دلوں میں کروٹیں لے رہی ہے۔ ؎

سوزِ دل اشکِ رواں آہِ سحر نالۂ شب
ایں ہمہ از اثرِ یادِ شما می بینم

تمدنِ جدید کی صنعت کاریاں بیشک دل فریب اور جاذبِ نظر ہیں لیکن حقیقی سکونِ قلب، طمانیتِ خاطر، باہم محبت اور اخوت و مساوات

کے روح پرور نظارے جو اُس مقدس دور میں دیکھنے والوں نے دیکھے تھے۔ ان کے لئے انسانیت آج تک مضطرب و بے قرار ہے۔ اور عصرِ رواں کی مادی تہذیب جس قدر بڑھتی اور پھیلتی جائیگی، اسی قدر عالم انسانی کا اضطراب بڑھتا جائیگا۔

بہرحال اب ضرورت ہے۔ کہ اس جماعت (امتِ مسلمہ) کے فکر و عمل میں نئے سرے سے تبدیلی لائی جائے اور دنیا و دین کے متعلق اسکے جدا جدا نقطہ ہائے نظر کو یکسر بدل دیا جائے۔ یہاں تک کہ یہ خیال اسکے دل کی عمیق گہرائیوں میں اتر جائے کہ دین کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسکو ایک کامل اور ہمہ گیر نظامِ حیات کی حیثیت سے قبول کیا جائے۔ اور زندگی کا کوئی شعبہ اسکی ہدایت و رہنمائی سے محروم نہ ہو۔

دراصل حقیقی یا تعمیری انقلاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ انقلاب کے بعد زندگی کا نقطۂ نظر ہی بدل جائے۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ انسانوں کے قلوب و اذہان سے انقلابی مہم کی ابتدا ہو۔ جب تک دلوں میں صالح انقلاب پیدا نہ ہو اُسوقت تک معاشرہ کی تشکیل کسی صورت میں ممکن نہیں ہے۔ اور حضرات انبیاء علیہم السّلام کے طریق دعوت و انقلاب کے مطابق ابتدا میں چند مقدس نفوس اور اہلِ علم و تقوٰی کی تنظیم سے اس کام کا آغاز کیا جائے۔ اور اس جدید ملّی تنظیم کے اصول و مبادی بھی اسوۂ نبوت اور منہاج سنت سے ماخوذ ہوں۔ آئندہ ابواب میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ انقلاب، اور طریقِ اصلاح و تعمیر اور اس کے

اُصول و مبادی سے بحث کی جائیگی۔ لیکن اس سے پہلے ملّتِ اسلامیہ کے عواملِ فساد سے بحث کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ دورِ ماضی کے اسبابِ زوال پر گہری تنقیدی نگاہ فسادِ امّت کے نقطۂ ابتدا اور نقطۂ انتہا کی تعیین اور دورِ حاضر کی امم اسلامیہ کے ذہنی انتشار و طوائف الملوکی کے تاریخی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر تعمیرِ جدید کی کوئی کوشش ثمر بار نہیں ہو سکتی۔

اسبابِ زوالِ اُمّت کا عقلی تجزیہ

اسبابِ زوالِ اُمت کی تشخیص کے سلسلہ میں جن اسباب کا بار بار اعادہ کیا جاتا رہا ہے۔ انکی صحت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن انکی تعبیر محدود زاویہ فکر کی پیداوار ہے۔ اور اس مسئلہ پر وسیع تر انسانی نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئیے۔ کیونکہ مسلمانوں کا جب دعویٰ یہ ہے کہ قرآنی تصوّرِ زندگی ہمہ گیر اور عالمی حیثیت رکھتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہمہ گیر قرآنی تصورات کی روشنی میں اس مسئلہ کا تحقیقی جائزہ نہ لیا جائے۔

سب سے پہلے ایک بنیادی مسئلہ کی تنقیح ضروری ہے کہ عروج وزوال کے اسباب وعوامل تمام اقوام وملل کے لئے یکساں ہیں۔ یا ہر قوم کے اسبابِ عروج وزوال جدا جدا ہیں؟ دوسری صورت بعید از عقل ہے کہ ہر قوم کے لئے الگ الگ قوانینِ فطرت ہوں، بلکہ حکمتِ قرآنی بھی اس خیال کی تردید کرتی ہے۔ قرآن حکیم سے مفہوم ہوتا ہے کہ کائناتِ انسانی کا نظام جن اٹل اور محکم قوانینِ فطرت پر مبنی ہے۔ وہ قوانین ہر قوم وملک کے لئے الگ الگ نہیں ہیں۔ فطرت اللہ ایک ہی ہے۔ اور وہ تمام انسانوں کو یکساں طور پر مخاطب کرتی ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۔ (آیہ)	یہ وہی فطری دین ہے جس پر خدا نے انسانوں کو پیدا کیا۔ اور خدا کی پیدائش میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی وہ دینِ محکم ہے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔
سُنَّةَ اللّٰهِ فِی الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا ۔ (آیہ)	یہ خدائی قانون ہے جو گذشتہ اقوام میں جاری و ساری رہا ہے۔ اور تم خدائی قانون میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔

در اصل پوری انسانی تاریخ اسی "فطرت اللہ" اور "سنت اللہ" کی عملی تعبیر و تفسیر ہے۔ اور اقوام دنیا کا عروج و زوال ہمیشہ اسی سے وابستہ رہا ہے۔

فطرۃ اللہ کا منشا یہ ہے کہ دنیا کے انسانوں میں تحزب و افتراق نہ ہو۔ سب کا ایک ہی مقصودِ حیات ہو۔ جس کی جانب وہ بے تابانہ حرکت کریں۔ اور ان کے عقیدہ و مسلک میں کسی طرح کا اختلاف و تضاد نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم جب انسانیت کے مشترکہ نصب العین کا ذکر کرتا ہے تو بلا تخصیص تمام انسانوں کو "الناس" کے عام لفظ سے خطاب کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں اس مضمون کی کئی آیات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء آفرینش میں تمام انسان "امت واحدہ" تھے۔ اور ان کا ایک

ہی دستورِ حیات تھا۔ مگر مفاداتِ جزئیہ اور اغراضِ عاجلہ نے ان کو غلط راستہ پر ڈالدیا اور وہ کئی فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیْنَہُمْ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۔	شروع میں تمام انسان قوم واحد تھے پس انہوں نے اختلاف کیا۔ اگر پہلے سے یہ بات طے شدہ نہ ہوتی (کہ قبول اور عدم قبول کو خود انسان پر ہی چھوڑ دیا جائے) تو ان کے اختلاف کا آخری فیصلہ کر دیا جاتا۔

یہ اختلاف چونکہ فطرۃ اللہ کے منشا کے خلاف تھا اسلئے خدائے قادر نے ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا سلسلہ جاری کیا۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ وَاَنْزَلَ مَعَہُمُ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ ۔	لوگ ایک ہی امت تھے (انہوں نے باہم اختلاف کیا) تو اللہ تعالٰے نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبیوں کو بھیجا۔ اور انکے ہمراہ کتاب نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان اختلافی باتوں کا فیصلہ کریں۔

وحدتِ انسانی کے ہمہ گیر قرآنی تصور کے پیشِ نظر یہ دعوی یقیناً حق بجانب ہے کہ انسانیتِ عامہ کی فلاح چند عالمگیر اور محیطِ کل اصولِ فطرت سے وابستہ ہے۔ جو اقوام ان اصول و قوانین کا احترام کرتی ہیں وہ بہر حال عزت و وقار کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتی ہیں۔ اور جو قومیں ان قوانین کی توہین کرتی ہیں، دنیا کی ذلت و رسوائی انکے حصہ میں آتی ہے۔ اور اسمیں

رنگ و نسل، نام اور مرز و بوم کا کوئی لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ یہ قوانین فطرت وہ محکم اور غیر متزلزل حقائق ہیں جن پر زمان و مکان کا اختلاف اثر انداز نہیں ہوتا اور ہر لمحہ انسانی زندگی ان سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔

اس سے انکار نہیں ہے کہ ہر قوم و ملت کے جداگانہ وجود کے بقا کے لئے کچھ مخصوص عوامل ہوتے ہیں۔ جو محض اس قوم کے خصوصی تشخص پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن عام انسانی قوانین کی نظر میں تمام قومیں یکساں ہیں۔

قوانین فطرت کا تجزیہ انسانی زندگی دو بڑے شعبوں میں منقسم ہے۔ داخلی اور خارجی۔ یا روحانی اور مادی۔ اوّل الذکر شعبہ اخلاقی اور مابعد الطبیعی قوانین سے متعلق ہے۔ اور دوسرے شعبہ میں مادی اور طبعی قوانین تصرف کرتے ہیں۔ سیاست و معیشت اور معاشرت وغیرہ اسی دوسرے شعبہ کے اجزا ہیں۔ جس طرح مذکورہ داخلی اور خارجی شعبوں کے لئے الگ الگ قوانین ہیں۔ اسی طرح خارجی شعبہ کے مختلف اجزا کے لئے بھی جدا جدا قوانین ہیں۔ یہ تمام قوانین اپنے اپنے دائرۂ عمل میں کارفرما رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہے۔ کہ جس طرح زندگی کے مختلف شعبے ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں اسی طرح ان کے قوانین بھی اگرچہ اولاً و بالذات اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ لیکن مآل اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک شعبۂ زندگی کے قوانین دوسرے شعبوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور بالآخر ایک شعبہ کا فساد پوری زندگی کے فساد پر منتج ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے

کئی ایسی اقوام کا ذکر کیا ہے۔ جن کی زندگی میں معیشت کی راہ سے فساد و اختلال داخل ہوا۔

— وکم اھلکنا من قریۃٍ بطرت معیشتھا فتلک مساکنھم لم تسکن من بعدھم الا قلیلا۔ (قصص)

بہت سی قومیں جو اپنی معیشت میں حد اعتدال سے بڑھ گئی تھیں، ہم نے انکو ہلاک کیا۔ پس یہ انکے مکانات ہیں۔ جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے ہیں۔

یہ خیال کہ زندگی کے مختلف اجزا میں الگ الگ قوانین کارفرما رہتے ہیں۔ واقعاتی نقطۂ نظر سے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر دور میں ایسی قومیں ملتی ہیں جو سیاسی اعتبار سے محکوم یا پسماندہ ہوتی ہیں لیکن معاشی لحاظ سے وہ اقوام عالم کی صف اوّل میں جگہ پاتی ہیں۔ اور ایسی اقوام بھی ہوتی ہیں جو سیاسی طور پر آزاد اور خود مختار ہونے کے باوجود معاشی لحاظ سے دنیا کی پسماندہ اقوام میں انکا شمار ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ سیاست، معیشت اور دیگر شعبوں کے لئے جدا جدا قوانین ہیں۔ اور جو قوم کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کے قوانین پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔ وہ بہرحال اس شعبہ میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتی ہے۔

آج مغربی اقوام اقتدار، سیاست اور ذرائع معیشت کے لحاظ سے عدیم المثال عظمت و شوکت کی مالک ہیں۔ مگر روحانی فیوض و کمالات اور اخلاقی برتری سے یکسر تہی دامن ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ ان اقوام نے صرف مادی حقائق کے فہم و ادراک اور طبعی انکشافات ہی کو اپنا مطمحِ نظر

بنا لیا ہے اور اخلاقی اقدار یا مابعد الطبیعی تصورات کو انہوں نے کلّی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔

شرق حق را دید عالم را نہ دید
غرب در عالم خزید از حق رمید (اقبالؒ)

یہی وجہ ہے کہ مادہ وجسم کے انتہائی عروج کے باوجود آج تک عالم انسانی زندگی کی اُس حقیقی مسرت سے محروم ہے جسکی خواہش ہر انسان کے تحت الشعور میں کارفرما ہے۔

قرآنی تصورِ حیات قرآن حکیم نے انسان کو ایک جامع اور کامل ضابطۂ حیات عطا کیا ہے جو کسی ایک ہی شعبۂ زندگی سے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ حیات انسانی کے تمام داخلی اور خارجی شعبوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ یعنی وہ مکمل قانون کی حیثیت سے نہ صرف مادہ وجسم کی ارتقائی حرکت کی نگرانی کرتا ہے۔ بلکہ تطہیرِ فکر اور تزکیۂ نفوس کے ذریعہ انسانی ذہن میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اسلئے قرآنی تصورِ زندگی اور قرآنی ضابطہ حیات کے ذریعہ جس معاشرہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ اس میں مادہ و روح، فکر و عمل، دانش و عشق، روحِ تمدن اور اخلاق و سیرت کا کچھ ایسا امتزاج ہوتا ہے کہ انسانی زندگی حقیقی طور پر پُرامن پُرسکون اور خوشحال بن جاتی ہے۔ یہی وہ زندگی ہے جس کو قرآن حکیم نے "حیاۃ طیبہ" اور "عیشۃ راضیہ" (پاکیزہ زندگی اور خوشگوار زندگی) کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ اور اسی سے انسان کو مسرتِ دوام اور عیشِ مسلسل

حاصل ہوتی ہے۔ یہ معاشرہ عصرِ حاضر کے ان تمام مہالک وخطرات سے پاک ہے جو اقوامِ حاضرہ کی مادہ پرستی اور عقلیتِ محضہ کی وجہ سے عالمِ انسانی پر منڈلا رہے ہیں۔

اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

عیشِ دوام اور مسرتِ جاودانی کا حصول اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جبتک کہ حیاتِ انسانی کے تمام حقیقی مطالبات کی تکمیل نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانی صرف مادہ وجسم کا نام نہیں ہے کہ آج کی اقوام کی طرح صرف اسی کو مرکزِ توجہ بنا لیا جائے۔ بلکہ اسکے علاوہ زندگی کے کچھ دوسرے مطالبات ہیں جن کو محض ظن وتخمین سے حل کرنا ممکن نہیں ہے۔

راہبر ہو ظن وتخمین تو زبوں کارِ حیات

انسانی زندگی تاریخ کے ہر دور میں حکمتِ قرآنی کی محتاج ہے۔ اور قرآن حکیم ہر نئے دور کے لئے اپنے پاس تازہ اور تابناک روشنی رکھتا ہے

کہنہ گردد چوں جہاں اندر برش
می دہد قرآں جہانے دیگرش

چنانچہ خود قرآن حکیم کا یہ دعوی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام مسائل کے لئے کامل اور جامع حل پیش کرتا ہے۔ اور زندگی کا کوئی زاویہ اسکی نگاہ سے اوجھل نہیں ہے۔

قد جاءکم من اللہ نور تمہارے پاس خدا کی طرف سے روشنی

وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۔

(المائدہ)

اور کتاب مبین آچکی ہے۔ جو رضاء الہی اور امن کی راہ پر چلنا چاہتا ہے۔ یہ کتاب اسکی رہنمائی کرتی ہے۔ اور انکو ظلمت و تاریکی سے نکال کر خدا کے حکم سے نور کی طرف لے جاتی ہے۔ اور انکو سیدھی راہ پر چلاتی ہے۔

عروج زوالِ اقوام اور قرآن

ان تصریحات کے پیش نظر علی وجہ البصیرت یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم مجموعۂ قوانین فطرت ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے مفصل اور جامع دستور پیش کرتا ہے۔ یعنی جہاں اس نے سیاست، معیشت اور معاشرت کے قوانین تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ وہاں انسان کے داخلی شعبہ کو اسکی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر زیادہ توجہ و التفات کا مستحق قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآنی انقلاب کا مفہوم کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کی تبدیلی نہیں ہے۔ بلکہ پوری زندگی کی تبدیلی ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ نزول قرآن سے پہلے دنیا ان قوانین فطرت سے نا آشنا تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانی پیدائش کے ساتھ ہی انسان کو ان بنیادی اصول و قوانین کی تعلیم دی گئی تھی۔ اور تاریخ کے ہر دور میں ان کی تجدید ہوتی رہی ہے۔ انبیاء و رسل نے ہر زمانہ میں ان قدرتی قوانین کے مجموعہ (دین) کے احیاء کے لئے جد و جہد کی ہے۔ اور

تاریخ کا کوئی دور اس ضابطۂ حیات کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں سے خالی نہیں رہا۔ ہاں! قرآن کریم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اس قانون کو ایک جامع منضبط اور دوامی شکل عطا کی ہے۔ یعنی قرآنی دستورِ زندگی ان ہمہ گیر تصورات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی ہے۔ اور زمان و مکان کی تحدید سے آزاد ہے۔

ان ھو الا ذکر للعالمین ۔ قرآن کریم تمام عالموں کے لئے ذکر ہے
ولتعلمن نبأہٗ بعد حین ۔ اور تم کچھ مدت کے بعد اس حقیقت کو ضرور جان لوگے۔ (آیہ)

ہم گذشتہ صفحات میں ان قوانین فطرت کی نسبت لکھ آئے ہیں، کہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے کچھ جدا جدا قوانین ہیں۔ اور انسانوں کی کوئی جماعت جب کسی ایک ہی شعبۂ زندگی کے قوانین پر عمل کرتی ہیں۔ تو وہ بہرحال اس شعبہ میں کمال پیدا کر لیتی ہیں۔ اگرچہ یہ کمال دوسرے شعبوں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے عارضی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ اور اسکا انجام یقیناً ہلاکت و بربادی ہے۔

اس اصول کی بنا پر یہ سوال خود بخود ہی حل ہو جاتا ہے کہ آج سیاسی اقتدار اور معاشی برتری کے اعتبار سے غیر مسلم اقوام عروج و اقبال کی بلند چوٹیوں پر کھڑی ہیں۔ اور مسلمان قرآن حکیم کو مانتے ہوئے بھی سیاسی اور معاشی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اعلیٰ سیاسی اقتدار اور امامتِ اقوام کے لئے جن

اُصول و قوانین کی ضرورت ہے۔ ایک مدت سے مسلمان ان کو چھوڑ چکا ہے
قومی کردار اور ملی سیرت کی بلندی، آہنی عزم، علوم طبیعیہ کی مہارت
اور ملی شعور وغیرہ وہ امور ہیں جو کسی قوم کو آسمانِ سیاست کی بلندی
پر پہنچاتے ہیں۔ اور قرآن حکیم نے ان اُمور کو متعدد دفعہ ذکر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ۔ (الانفال)	اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو۔ اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی امانتوں کی خیانت کرو۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔ (آل عمران)	اے ایمان والو! صبر کرو۔ دوسروں کو صبر کی تلقین کرو۔ اور آپس میں ایک دوسرے سے بندھ جاؤ۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم نجات پا سکو۔
لَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔ (الانفال)	آپس میں اختلاف نہ کرو۔ کہ تم کمزور ہوجاؤ گے۔ اور تمہاری اندرونی طاقت جاتی رہیگی۔

(وغیر ذالک من الآیات)

اسی طرح کسی قوم کی اقتصادی خوشحالی اور معاشی برتری کے لئے ضروری ہے۔ کہ اسکے افراد میں مخلصانہ تعامل اور ہمدردانہ تعاون موجود ہو۔ اور وہ تقسیم دولت کے فطری قانون پر عمل پیرا ہوں۔ نیز ہر شخص ذاتی اور شخصی خوشحالی سے زیادہ اجتماعی خوشحالی کے لئے سرگرم عمل ہو۔ قرآن کریم نے

ان معاشی اصولوں کو کئی مرتبہ بیان کیا ہے۔

یمحق اللہ الربا ویربی

الصدقات۔ (البقرہ)

یعنی سود اور اس قسم کے دوسرے کاروباری معاملات جن سے دولت تقسیم ہونے کے بجائے چند اشخاص میں سمٹ جاتی ہے۔ ان سے بالآخر قوم کی معاشی حالت ناہموار ہو جاتی ہے۔ جس سے خطرناک طبقاتی تصادم پیدا ہوتا ہے۔ اور صدقات یعنی سوسائٹی کے پس ماندہ عناصر کو ابھارنے کی کوشش اور تقسیم دولت کے جملہ ذرائع سے مملکت و ریاست کی دولت و خوشحالی میں اضافہ ہوتا ہے۔

کَیۡلَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ۔ تاکہ یہ مال و دولت صرف مندوں ہی میں نہ چکر کاٹتا رہے۔ (بلکہ غربا کو بھی اسکا حصہ ملےکے)

دراصل سیاست اور معیشت کے ان قوانین میں جو اصل کارفرما ہے وہ قومی شعور، ملی احساس اور پرخلوص تعاون ہے۔ یہ اجتماعی روح جس شعبۂ زندگی میں زیادہ مضبوط اور طاقتور ہوتی ہے اسی تناسب سے یہ شعبہ نمایاں حیثیت پیدا کرتا ہے۔

اسبابِ ذاتیہ اور اضافیہ

اگر سرسری اور سطحی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر قوم بلکہ قوم کے ہر حکمران طبقہ کے اسباب زوال جدا جدا معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگوں کی نگاہیں ان سطحی اسباب پر ہی رک جاتی ہیں۔ اور اس سے آگے یہ نہیں دیکھ سکتیں

کہ یہ محسوس اور مشہور اسباب خود ہی مؤثر بالذات ہیں۔ یا ان کی تہ میں کوئی دوسرا داعیہ کارفرما ہے جو ان جستی اسباب کے لئے اصل منبع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اسی سے ہزارہا اسبابِ فساد پھوٹتے اور اُبلتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی غلطی ہے جسکی وجہ سے آج تک اصل سببِ مرض کی تشخیص نہیں ہوسکی اور نہ ہی کوئی معقول اور موثر علاج تجویز ہوسکا ہے۔

دراصل سب سے پہلے انسانی جماعات کے اسبابِ عروج کا نظری طور پر جائزہ لینا چاہئے۔ کہ ان اسبابِ عروج کے تعین کے بعد اسبابِ زوال کی تعیین میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوگی۔ کیونکہ اسبابِ عروج کی نفی ہی کا دوسرا نام اسبابِ زوال ہے۔

سطور بالا میں لکھا جاچکا ہے کہ چند اصولِ فطرت ہیں جو قوموں کے سیاسی اور معاشی عروج وارتقا کا سبب بنتے ہیں۔ ان میں ملّی احساس اجتماعی شعور اور جذبۂ تعاون و مواسات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن کچھ غائر نظر سے دیکھا جائے تو یہ اسباب بھی مؤثر بالذات یا اسبابِ اولیہ نہیں ہیں۔ اور حقیقی سبب دوسرا ہے۔ جو ان اسباب کی خارجی تشکیل کرتا ہے۔ وہ حقیقی سبب۔ ایک متعین مقصد کی افادیت کا محکم اور گہرا یقین ہے۔ یہ یقین واذعان ہی بے پناہ تخلیقی قوت ہے۔ جو بے شمار اضافی اور خارجی امور کو جنم دیتی ہے۔ ان امور میں سے ہر ایک کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے کہ اسکے حصول کے لئے سعی وکوشش کی جاتی ہے۔ اسکو مقصد کہنا چاہئے۔ اور اس لحاظ سے کہ یہ مقاصد مابعد کے لئے

ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اسکو سبب کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح یہ تمام امورِ خارجی ایک حیثیت سے مقاصد ہیں اور دوسری حیثیت سے اسباب! مگر ان میں جو روح کام کرتی ہے وہ اذعانِ مقصد ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ مقصد کیسا ہے۔ کامیابی کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ جس چیز کو آپ مقصد قرار دیتے ہیں اسکی افادیت کا یقین مضبوط اور غیر متزلزل ہو۔ بس یہ یقینِ محکم ہی آپ کے ظاہر و باطن میں محیر العقول تبدیلی پیدا کریگا۔ اور آپ کو لذتِ تخلیق سے آشنا کر دیگا بلکہ یہ یقین جتنا محکم، مضبوط اور گہرا ہوگا اتنا ہی آپ کی ذات میں جذب و تسخیر کی قوت نمایاں ہوتی جائیگی۔ عزم پختہ اور کردار بلند ہوتا جائے گا۔

یعنی اس کیلئے مقصد کی نوعیت کا سوال نہیں ہے۔ خواہ وہ مقدس اخلاقی نوعیت رکھتا ہو۔ یا خالص مادی ہو۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس مقصد سے آپ کو سچا عشق اور گہری محبت ہو۔ اور آپ اپنی زندگی کی ہر عزیز ترین چیز کو اس مقصد کی خاطر قربان کرنے ہی میں اپنی نجات تصور کرتے ہوں۔ اگر اس قسم کے خلوص کے ساتھ آپ منزل کا عزم رکھتے ہیں تو یقیناً آپ کو قانونِ قدرت کی تائید حاصل ہوگی۔ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اور اگر مقصد کی پُرخلوص محبت سے آپ کا دل خالی ہے تو یہ مقصد خواہ کتنا ہی

مقدس، کتنا ہی بلند اور کتنا ہی دلفریب کیوں نہ ہو۔ مگر کامیابی کی راہ آپ کے لئے مسدود رہے گی۔ ؎

تا ابد بوئے محبت بہ مشامش نہ رسد
ہر کہ خاکِ درِ میخانہ بہ رخسار نہ رفت

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ ایسی قومیں موجود رہی ہیں جن کا مقصدِ حیات صرف مادی اغراض کا حصول ہوتا ہے۔ مگر چونکہ ان کو اپنے مقصد کی افادیت کا گہرا یقین حاصل ہوتا ہے۔ اسوجہ سے وہ ان مادی مقاصد میں کامیاب ہوتی ہیں۔ مثلاً روس کی کمیونسٹ پارٹی کا مقصد معاشی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ اور کچھ دوسری مغربی اقوام "نیشنلزم" پر ایمان رکھتی ہیں مگر ان اقوام کا اذعانِ مقصد اس درجہ مضبوط اور محکم ہے۔ بلکہ وہ اس خالص مادی نصب العین سے اس حد تک لگن رکھتی ہیں کہ اس مقصدی وحدت نے ان میں پرخلوص جذبۂ اخوت، غیر متزلزل شعورِ ملی اور حیرت انگیز قوتِ کردار پیدا کر دی ہے۔ اور ان اوصاف ہی کی وجہ سے آج وہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن ہیں۔ ؎

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

— اسلام نے ملت کے لئے ایک اعلیٰ اور مقدس اخلاقی مقصد متعین کیا ہے۔ اور اسکے اذعان و یقین کو "ایمان" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ یہی اخلاقی اور الہیاتی رشتہ افرادِ ملت کو باہم ملا کر ان کو "بنیان مرصوص"

بناتا ہے۔ اور ان میں اعلیٰ درجہ کا قومی اخلاق اور اجتماعی کردار پیدا کرتا ہے۔ اور اسی مقصد سے امت کو پُرامن زندگی، اعلیٰ اقتدار اور امامتِ اقوام کا بلند تر مقام حاصل ہوتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ وَلَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْــٴًـا۔

اللہ تعالےٰ نے تم میں سے ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلافت کا منصب عطا کریگا جیسے وہ پہلی قوموں کو یہ منصب دیتا رہا ہے۔ اور اس دین کو جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے غلبہ و تمکنت عنایت کریگا اور ان کے خوف کو امن و بے خوفی سے بدل دیگا۔ ( )

"ایمان" محض تصوریت سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک حیران کن قوت موثرہ ہے جو تمام شخصی اور جماعتی اعمال میں انقلابی روح پیدا کرتا ہے۔ ؎

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی ۔۔۔ آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو ۔۔۔ خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

یہاں اس بات کا اظہار بھی از حد ضروری ہے کہ دوسری اقوام اگرچہ اپنے مادی مقاصد سے سچا عشق رکھنے کی وجہ سے اعلیٰ سیاسی اقتدار کی حامل ہیں۔ مگر روحانیت و اخلاقیات کے فقدان نے ان کو بے شمار

مفاسد و مہالک سے دوچار کر دیا ہے۔ اور اسو جہ سے وہ زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم ہیں۔ بلکہ ان کی بے پایاں سیاسی طاقت اور معاشی برتری خود ان کے لئے وبال جان بن رہی ہے۔ مگر اسلام نے حیاتِ انسانی کا جو اعلیٰ اور بلند تر نصب العین متعین کیا ہے۔ وہ ہمہ گیر اور محیطِ کل اخلاقی تصور ہونے کی وجہ سے تمام انسانوں میں پُرخلوص جذبۂ اخوت پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسو جہ سے اس میں ان مفاسد وخطرات کا کوئی امکان نہیں ہے۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون۔	بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے امن ہے اور وہ ہدایت پانے والے ہیں۔
(الانعام)	

ان تصریحات کے بعد اسبابِ زوال کا تعین کچھ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ عروجِ اقوام کا نقطۂ آغاز متعین مقصد کا اذعانِ محکم ہے۔ تو اس اذعان کا ضعف و اضمحلال زوالِ اقوام کا سبب اولین ہے یعنی تمام خارجی اور محسوس اسبابِ زوال در اصل اسی سرچشمۂ فساد سے اُبلتے ہیں۔ اور جس قدر یہ ضعفِ یقین بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اسی قدر جماعت کے قوائے عمل، سیرت و اخلاق اور اجتماعی احساس میں تزلزل، اور انتشار پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اعلیٰ صفات کی جگہ (ان کی) مخالف قوتیں نشو ونما پانے لگتی ہیں۔ یعنی ایسی اقوام کے قوائے عمل کمزور ہو جاتے ہیں۔

ملی سیرت پست ہو جاتی ہے۔ اور ان میں جماعتی شعور اور اجتماعی احساس کے علی الرغم شخصی قبیلوی اور خاندانی عصبیت اُبھر آتی ہے۔ اور بالآخر یہ خود غرضانہ رجحانات قوم کی ہلاکت و بربادی پر منتج ہوتے ہیں۔ مگر اس تباہی سے پہلے ایک طویل مدت تک اس کو محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کو دعوت دے رہا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اس مدتِ زوال کے دوران میں دفعتاً پہلی سی شانِ توانائی عود کر آتی ہے۔ اور قوم کا ہر فرد یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اب قوم از سرِ نو قوت و اقتدار کی اعلیٰ سطح پر آ گئی ہے۔ مگر اسکی یہ خوش فہمی دیر تک قائم نہیں رہتی۔ بالکل اسی طرح کہ بسترِ مرگ پر لیٹا ہوا مریض ایک عارضی وقفہ کے لئے دفعتہً کچھ افاقہ محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے ضعیف و ناتواں جسم میں کچھ زندگی و قوت کے آثار نمایاں پاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ تصور کر لیتا ہے کہ بس اب میں تندرست ہو گیا ہوں۔ مگر وہ جانتا نہیں کہ طبیعت اور مرض کے باہم مقابلہ کے دوران میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی عارضی سبب سے طبیعت مرض پر غالب آ جاتی ہے۔ اور اس عارضی وقفہ کے بعد مرض اس شدت سے حملہ آور ہوتا ہے کہ مریض کو ختم کر دیتا ہے۔

قرآن حکیم نے متعدد مقامات میں اقوام ماضیہ کے عروج و زوال کا ذکر کیا ہے۔ اور ان اقوام کے تذکرہ میں جو چیز اساسی درجہ رکھتی ہے وہ شرفِ انسانی کے اعلیٰ نصب العین کا عدمِ شعور ہے۔ جس نے

ان کی حیاتِ اجتماعیہ میں وہ تمام مفاسد و معائب پیدا کر دیئے تھے، جو قوموں کی ہلاکت و بربادی کا سبب بنتے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (الاعراف)

اگر یہ بستیوں والے (جن کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے) ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ لیکن انہوں نے تکذیب کی۔ پس ہم نے ان کو انکے اعمالؔ کی وجہ سے مبتلائے عذاب کیا۔

چونکہ مقصدِ حیات کا عدم شعور اور نفیِ یقین ہی تمام مفاسدِ اجتماعیہ کا سرچشمہ ہے۔ اسلئے خدائے قدوس نے نہایت بلیغ اور موثر انداز میں مسلمانوں کو اس سرچشمۂ ضلالت سے مجتنب رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ۔ (حدید)

کیا مسلمانوں کے لئے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور اسکے پیغام کے لئے جھک جائیں؟ اور انکی طرح نہ ہو جائیں جنکو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔ پس ان پر ایک طویل عرصہ گذرا۔ اور ان کے دل سخت ہو گئے۔ اور ان میں سے بہت لوگ نافرمان ہیں۔

یہاں تک عمومی نقطۂ نظر سے اسبابِ زوالِ امم پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس بات کو واضح کیا گیا ہے کہ ترکِ قرآن اور زوالِ اُمت میں عقلی اور منطقی طور پر کیا تعلق ہے؟ مگر اس بحث سے چند نہایت دقیق اور اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) تاریخی اعتبار سے زوالِ اُمت کا نقطۂ آغاز کیا ہے

(۲) تاریخ کے ہر دور میں کس کس راستہ سے مسلمانوں کے نظامِ اجتماع اور شیرازۂ ملی میں فساد داخل ہوا۔

(۳) اسبابِ فساد کے لحاظ سے آج ملتِ اسلامیہ کس جگہ پہ کھڑی ہے۔

ہم آئندہ صفحات میں ان مسائل سے بحث کرینگے۔

تاریخِ زوالِ اُمّت کا تحقیقی جائزہ

یوں تو ہر قوم کی تاریخ اپنے اندر کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتی ہے۔ لیکن امت مسلمہ کے مدوجزر اور نشیب و فراز کی داستان کچھ ایسی مجموعۂ اضداد ہے کہ انسان اسکے تحقیقی مطالعہ کے بعد حیرت و استعجاب کے بحرِ عمیق میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر آپ اسکی تیز رو اُٹھان اور حیرت انگیز رفتارِ ترقی کی جانب نگاہ اُٹھائینگے تو اقوام دنیا کی تمام رفعتیں اسکے آگے پست نظر آئیں گی۔ اور اگر اسکے دورِ تنزل کی بو العجبیوں کا نظارہ کرینگے تو اس میں بھی آپ کو عجیب و غریب منظر دکھائی دے گا۔

حدیث دردِ دل آویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد!

یہ عجیب بات ہے کہ دوسری قومیں ایک دفعہ اپنی شانِ جبروت اور نظارۂ سطوت و شوکت دکھا کر اس طرح روپوش ہوگئیں کہ آج ان کے آثار ہی سے ان کے تاریخی وجود کی شہادت ملے تو ملے لیکن خود ان کا وجود ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے مٹ چکا ہے۔

وکم اھلکنا من قریۃٍ — بہت سی قومیں جو اپنی معیشت میں حایِ

بطرت معیشتها فتلك مسٰكنهم لم تسكن من بعدهم الاقليلا وكنا نحن الوارثين۔ (قصص)

اعتدال سے بڑھ گئی تھیں۔ ہم نے ان کو ہلاک کیا پس یہ انکے مکانات ہیں جو انکے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں۔ اور اصل وارث تو ہم ہی ہیں۔

اہل یونان کی عظمت وشوکت قصۂ پارینہ بن چکی ہے نہ ساسانیوں کی سطوت کا آج کہیں نام ونشان نہیں ہے۔ اہلِ مصر کا جاہ وجلال اس طرح رخصت ہوا کہ آج اسکی داستان سرائی سے دنیا لطف اندوز ہوتی ہے۔ عاد وثمود اور سبا جیسی طاقتور قومیں دنیا میں آئیں، اور اپنی بے پایاں قوت وشوکت کا ایک ڈرامائی منظر دکھا کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں اور سرداران مکہ کا غرور وپندار قلیبِ بدر کی پہنائیوں میں دفن ہو گیا۔

واسترجعت[1] من بنی ساسان ما وهبت
ولم تدع لبنی یونان من اثر
ومزقت[2] سبأ فی کل ناحیة
فما التقی رائح منهم بمبتکر
ویوم[3] القلیب بنو بدر فنوا وسعی
قلیب بدر بمن فیه الی سقر (ابن عبدون اندلسی)

---

[1] زمانہ نے ساسانیوں کو جو کچھ بخشا تھا وہ سب الٹے لیا۔ اور اہل یونان کی کوئی نشانی باقی نہ رہنے دی۔
[2] اہل سبا کے ملک کے ہر گوشہ میں ٹکڑے اڑا دیئے۔ کسی صبح کرنے والے کو ان کی ہوا بھی نہ پہنچ سکی۔
[3] بدر کے دن اہل بدر (قریش) فنا ہو گئے۔ اور قلیب بدر (کنواں) انکو ساتھ لیکر جہنم میں چلا گیا۔

مگر امتِ مسلمہ کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے۔ کہ اس کو ہزاروں دفعہ طوفانِ حوادث سے ٹکرانا پڑا۔ بارہا اسکے خون کے دریا بہائے گئے اور دنیا کی تمام قوموں نے متحدہ محاذ بناکر اسکو مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مگر کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ جو قومیں اس کو ختم کرنے کے لئے آگے بڑھیں وہ یا تو خود ختم ہو گئیں۔ اور یا اُن کو اسلام کے دامن میں پناہ لینی پڑی۔ ؎

تو نخل خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند با تو پیوستند

اہلِ روم نے اس نوزائیدہ ملت کے مٹانے میں کون سی کسر اُٹھا رکھی تھی۔ ایران کے آتش پرستوں نے گلشنِ اسلام کی بہاروں کو خاکستر بنانے میں کونسا دقیقہ فروگذاشت کیا تھا۔ اور تاتاریوں کے سیلابِ بلا انگیز کی طغیانی کس طرح عباسیوں کی عظمت و شوکت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گئی تھی؟ یہاں تک کہ دنیا کو یقین ہو گیا تھا کہ اب مسلمان قوم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی، مگر ہوا کیا؟ رومیوں اور ساسانیوں کی حکومتیں اس طرح مٹ گئیں کہ انکی عظمت و شوکت کی صرف یادہی دلوں میں باقی رہ گئی ہے، اور تاتاریوں کا شعلۂ سوزاں امتِ مسلمہ کی دستارِ عظمت کا خوشنما پھول بن گیا۔

آتشِ تاتاریاں گلزار کیست؟ شعلہ ہائے او گل دستار کیست؟
از تہ آتش بر اندازیم گل نارِ ہر نمرود را سازیم گل

رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری جہانداری نماند
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونق خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہہ اہرام ماند
در جہاں بانگ اذاں بود ست و ہست — ملت اسلامیاں بود ست و ہست
عشق از سوز دلِ ما زندہ است — از شرار لا الٰہ تابندہ است
گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما — گلستاں میرد اگر میریم ما

امت مسلمہ کی تاریخ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دوسری اقوام جب رو بہ تنزل ہونے لگتی ہیں تو ان کے تمام فرقے اور افراد یکساں طور پر ذہنی انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں اہل حق کی کوئی جماعت یا فوق العادت انقلابی شخصیت باقی نہیں رہتی۔ مگر تاریخ اسلامی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہاں اگر ایک طرف خود غرض، جاہ پسند اور غدارانِ ملت کی جماعت کے ہاتھوں ملت کی بیخ کنی کے سامان ہو رہے ہوتے ہیں تو دوسری طرف پرستارانِ حق کی کوئی جماعت یا انقلابی شخصیت بر وقت سامنے آجاتی ہے۔ جو مسلمانوں کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحلِ مراد تک لے جاتی ہے۔ اور اس طرح آنے والی تباہی ایسے مقدس اشخاص کی فوق العادت قوتوں کے ذریعہ ٹل جاتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی کے ہر دور میں یہی کچھ ہوتا رہا ہے۔ اور اسکی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدائے قدوس ملت اسلامیہ کو تا قیامِ قیامت باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اور اسی کے ہاتھ سے عالم انسانی میں ہمہ گیر فکری اور اخلاقی انقلاب بپا کرنا چاہتا ہے۔

- ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ۔
خدا کی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا۔ تاکہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آجائے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ شیوۂ آذری اور سنت ابراہیمی کا عجیب وغریب امتزاج ہے۔ جب بھی اس امت میں کوئی بت گر اور بت فروش پیدا ہوا خدائے وحدہٗ لاشریک نے فوراً کسی بت شکن کو بھیجدیا۔ جس نے حق کی ضربتِ کاری سے بتانِ باطل کے پرزے اُڑا دیئے ؎

پاش پاش از ضربتش لات و منات

بہرحال اس حقیقت سے اغماض نہیں کیا جاسکتا کہ جس طرح ملت اسلامی کا دورِ ارتقاء اپنے اندر چند در چند خصوصیات رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کا دورِ زوال بھی اپنی مثال آپ ہے۔ چنانچہ اسکے دورِ انحطاط میں اگر خود غرض اور ملت فروش عناصر کی بہتات نظر آتی ہے۔ تو اہل حق کی صدائے عشق بھی ہر زمانہ میں اپنی انقلابی روح کے ساتھ کارفرما رہی ہے۔

از صدائے سخن عشق نہ دیدم خوشتر
یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

ایسا کیوں نہ ہو جبکہ خود بانئ ملت علیہ التحیۃ والسّلام نے واشگاف الفاظ میں فرمادیا ہے۔

لا تزال من امتی امۃ یقاتلون علی الحق۔ (اخرجہ ابوداؤد)
میری امت میں ہمیشہ ایک ایسا گروہ رہیگا جو حق کی حفاظت کے لئے لڑتا رہیگا۔

حقیقت میں اس امت کے بقاء و دوام کا یہی ایک راز ہے۔ ورنہ اگر انکی اپنی بداعمالیوں اور خود فراموشیوں کی جگر سوز داستان کو سامنے رکھا جائے اور پھر ان دشمنانِ ملت کے عزائم کا جائزہ لیا جائے جو ہر دور میں ملت اسلامی کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں تو اس کا صفحۂ ہستی پر باقی رہنا ناممکن تھا۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اسلامیوں کو جس مقصد کے اٹھایا گیا تھا اسکے پیش نظر ان کا محض وجود و بقا ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے قوی تر، غالب تر، اور موثر تر وجود کی ضرورت ہے جو اپنی سریع الاثر قوتِ نفوذ سے انسانی دنیا میں مخصوص طرز کا اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کر سکے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔	اور اسی طرح ہم نے تم کو متوسط امت بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہ اور نگران بنو اور رسولؐ تم پر گواہ اور نگران بنیں۔

"امتًہ وسطًا" کے لفظ میں اس امر کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ امت مسلمہ کو انسانی دنیا میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس طرح دائرہ کا وجود و بقاء اپنے محور کے وجود پر انحصار رکھتا ہے۔ اسی طرح عالم انسانی کا وجود و بقا ملت اسلامیہ کے وجود کا محتاج ہے۔

گلستاں میرد اگر میریم ما

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وجود موثر امتِ مسلمہ سے کس طرح چھنا اور اسکے

اسباب ودواعی کیا ہیں؟ اور اب اگر اسکے وجود کو مؤثر بنانا مقصود ہے۔ تو اسکے لئے کونسا لائحۂ عمل اختیار کیا جائے۔ اسی نقطۂ نظر سے ہم اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں گے۔

ملتِ اسلامیہ کا تعمیری اور ارتقائی دور

فطرتِ انسانی میں خیر اور شر کی متضاد قوتیں ودیعت رکھدی گئی ہیں۔ اسلئے یہ ممکن نہیں ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے کوئی ایک قوت کلیۃً فنا ہوجائے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ انسان اپنی مخصوص فطری صلاحیت، ماحول کے طبعی اقتضائی یا کسی فوق العادت شخصیت کے معجزانہ طرز اصلاح وتعمیر سے اپنے قلب ونظر کی نیک صلاحیتوں کو اس قدر موثر اور اُجاگر کرے کہ قوتِ شر کے پھیلاؤ کی تمام راہیں بند ہوجائیں۔ اور وہ گوشۂ عافیت میں سمٹ کر رہ جائے۔

اسی طرح یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قوتِ شر شخصی استعداد اور ماحول کی مدد سے قوتِ خیر کو بے اثر بنادے۔ مگر کسی ایک قوت کے غلبہ واستیلاء کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اسکی مخالف قوت بالکل معدوم ہوجاتی ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہ قوتِ مغلوبہ حالات کی منتظر رہتی ہے۔ اور جب بھی کہیں قوتِ غالبہ کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگتی ہے۔ تو یہ جھٹ اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

مگر یہ بات ناقابل انکار ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کو ہدایت وارشاد کا جو اعلےٰ منصب ذاتِ خداوندی کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اسکا قدرتی

اقتضا یہ ہے کہ انکی زندگی از اول تا آخر بے داغ اور معصوم ہوتی ہے - انکے قوائے خیر کو ہر وقت پردۂ غیب سے مدد ملتی ہے - اور قوائے شر کو کبھی اُبھرنے کا موقع نہیں مل سکتا - اسلئے مقامِ نبوت متذکرہ بالا کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور نبی کے سوا کسی دوسری شخصیت کے متعلق ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہر نقص و خطا سے محفوظ ہے - ہاں دوسرے لوگوں میں مراتب و مدارج کا اختلاف ہو سکتا ہے - اور ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو دوسروں کی نسبت بہت زیادہ ہوائے نفس پر غلبہ و اقتدار رکھتے ہیں اور ان سے بہت ہی کم لغزش سرزد ہوتی ہے - اس فروری تمہید کے بعد اسلام کے مختلف ادوار پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ خیر اور شر کی کشمکش یا نصب العین کے اذعان و یقین کی شدت اور ضعف سے ہر دور میں کیا کیا نتائج مرتب ہوتے رہے ہیں -

دورِ رسالت

خیر اور شر کی تمیز ایک ذہنی عمل ہے - اور اسکے لئے ایک خاص قسم کی بصیرت کی ضرورت ہے جو مقصدِ حیات کی راہ میں پیش آنے والے امور کی تجرید کرتی ہے - اور ان پر خیر یا شر کا حکم لگاتی ہے - اور جن لوگوں کا کوئی مقصد ہی نہ ہو ان کے نزدیک خیر اور شر کی تمیز بے معنی چیز ہے -

سردارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے عالمِ انسانی ہمہ گیر ذہنی انتشار اور لامقصدیت میں مبتلا تھا - پوری کائناتِ انسانی میں زندگی کا پاکیزہ اور واضح تصور رکھنے والی کوئی قوم بھی موجود نہ تھی - اس

دور کے انسانوں کا تصورِ حیات قبیلہ و نسب کی روایتی عظمت و شرافت، خاندانی وجاہت اور قومی برتری کے سوا کچھ نہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس پیمانہ تصور کو انسانیت کا مقصد نہیں قرار دیا جاسکتا۔ بلکہ حقیقت میں یہ انسانی مقصدِ حیات کی ضد ہے جس سے خطرناک انتشار و لامرکزیت کی وبا پھوٹتی ہے۔ کیونکہ جب انسانی جماعات کے سامنے کوئی وسیع تر اور ہمہ گیر تصورِ حیات نہ ہو۔ اور ہر انسانی گروہ جدا جدا مقصدِ زندگی رکھتا ہو۔ تو اس صورت میں ان کے مفاداتِ جزئیہ اور اغراضِ فاسدہ کا باہم تصادم ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ بعثتِ نبوی سے قبل دنیا کی تمام قوموں کی بالکل یہی کیفیت تھی۔ ہر گروہِ انسانی ہر قبیلہ خاندان۔ بلکہ ہر ایک فردِ انسانی کا جدا جدا نظریۂ حیات تھا۔ اور ان میں کسی طرح کا مقصدی اتحاد و اشتراک نہ تھا۔ یہی وہ ہلاکت آفریں انسانی دور تھا۔ جس کی نسبت قرآن حکیم نے ارشاد فرمایا ہے

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۔ (البقرہ)

اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ پر کھڑے تھے۔ پس اللہ تعالٰی نے تم کو اس سے بچایا۔ اللہ تعالٰی اسی طرح اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت کو پا سکو۔

سردارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے اس ہمہ گیر ذہنی لامرکزیت اور معاشری طوائف الملوکی کے پرخطر دور میں دنیا کے انسانوں کو ایک بلند تر وسیع تر اور مقدس مقصدِ حیات عطا کیا۔ یہ مقصدِ حیات کیا ہے؟ ایک الہی

پُرمسرت اور پُر امن زندگی کا حصول ہے۔ جو دائم اور مسلسل ہے۔ اور اسکا ایک سرا اعماقِ قلوبِ انسانی میں پیوست ہے اور دوسرا اُس ذاتِ ابدی سے جا ملتا ہے۔ جو کائنات کی اصل اور محسوسات سے وراء الوریٰ ہے۔ یعنی انسان اور ذاتِ خداوندی کا پُراسرار اور گہرا تعلق ہی حیاتِ انسانی کو جادۂ اعتدال پر قائم رکھ سکتا ہے۔ اسی سے دنیا کے تمام انسان ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک ہو سکتے ہیں۔ اور اسی سے انسانیت کو عیشِ جاوداں اور مسرتِ ابدی حاصل ہوتی ہے۔

سر عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس الٰہیاتی تصور کی بنیادوں پر ایک جدید ملت تعمیر فرمائی۔ اس ملت میں شامل ہونے والے ہر فرد سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ اپنی پوری زندگی خدا اور اس کے دین کے حوالے کریگا۔ اس کا سرِ نیاز رب العالمین کے سوا کسی دوسرے کے آگے ہرگز نہیں جھکے گا۔ بتانِ رنگ و نسل سے منحرف ہو کر صرف اللہ سے پیمانِ محبت و عقیدت استوار رکھے گا۔ اس کا عہدِ وفاداری کسی مخلوق کے لئے نہیں بلکہ صرف احکم الحاکمین کے لئے ہوگا۔ وہ اپنے تمام شخصی نسلی اور وطنی مفادات کو دینی اور ملی مفاد کی خاطر قربان کرے گا۔ اور اسکی پوری زندگی اس اعلیٰ و برتر مقصد کے لئے وقف ہوگی۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (آیہ)
اے نبی آپ لوگوں سے کہدیں کہ میری نماز، میری قربانی، میری
زندگی، میری موت، صرف خدائے لاشریک کے لئے ہے۔ مجھے
اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں پہلا مسلمان ہوں"

تابع حق دیدنش نا دیدنش
خوردنش نوشیدنش خوابیدنش

تاجدار دو عالم صلعم کا یہ پُر اسرار معجزہ تھا کہ جو شخص اس یقین و اقرار کے ساتھ ملت میں آجاتا۔ وہ فی الواقع اپنے اندر یہ اعلیٰ اور مقدس صفات پیدا کر لیتا تھا۔ یعنی وہ اپنے تئیں اس طرح جماعت میں گم کر دیتا تھا کہ گویا ملت کے اجتماعی مفاد اور اقامت دین کے سوا اسکے سامنے کوئی مقصد ہی نہیں ہے۔ اسکی زبان صرف حق کے لئے کھلتی تھی۔ اس کا ہر قدم اعلاءِ کلمۃ الحق کے لئے اُٹھتا تھا۔ اور اسکی تلوار صرف تحفظِ دین کے لئے میان سے باہر آتی تھی۔ یعنی ان کی جد وجہد قبیلہ و نسب کی عظمت کے لئے نہیں۔ بلکہ دین اور محض دین کی سر بلندی کے لئے وقف تھی۔ دینی اخوت نے ان میں ایسا نظم اور ڈسپلن پیدا کر دیا تھا کہ وہ جس طرف رخ کرتے تھے، فتح و نصرت انکی قدم بوسی کرتی تھی۔ اب انکے سامنے ایک واضح اور غیر مبہم نصب العین تھا اور اس نصب العین سے ان کو اس درجہ عقیدت و محبت تھی۔ کہ وہ اپنی زندگی کی عزیز ترین متاع کو اس پر قربان کرنے ہی میں اپنی نجات تصور کرتے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا عدیم المثال عروج و اقبال اسی

یقین محکم اور مقصد حیات کی گہری عقیدت کا رہین منت تھا۔

ملتے چوں می شود توحید مست قوت و جبروت می آید بدست
فرد از توحید لاہوتی شود ملت از توحید جبروتی شود
ہر دو از توحید می گیرد کمال زندگی این را جلال آن را جمال

جب تک صاحب رسالت علیہ التحیۃ والسّلام ان میں موجود رہے ان کی جدوجہد کا مرکز صرف یہی بلند تر اخلاقی مقصد رہا۔ ہوائے نفس، ذاتی اغراض قبیلوی اور خاندانی عصبیت ان کے یقین محکم کے سامنے سر نہ اُٹھا سکی۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ انسان (باستثنائے انبیا علیہم السّلام) خواہ کتنا ہی بلند نظر اور راسخ الفکر کیوں نہ ہو۔ مگر مفادِ ذاتی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اور زندگی میں کوئی وقت ایسا آ ہی جاتا ہے کہ اس کا جذبہ منفعتِ ذات، حمیتِ دینی یا مفادِ ملی پر غالب آجاتا ہے۔ چنانچہ زمانۂ رسالت میں بھی اسکی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

غزوۂ بدر میں جب مسلمانوں کو کفارِ مکہ کے مقابلہ میں عظیم الشان فتح نصیب ہوئی اور تقسیم غنائم کا وقت آیا تو کچھ نوجوانوں نے یہ کہدیا کہ لڑنے اور مرنے کے لئے ہم سب سے آگے ہوں اور اموالِ غنائم میں بڈھوں کو مساوی حصہ کیوں دیا جائے؟ اس موقع پر کچھ حضرات نے آنحضرت صلعم سے اموالِ غنیمت کے نسبت سوال کیا۔ اس پر سورۂ انفال کی ابتدائی آئتیں نازل ہوئیں۔ ان آیات میں جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اموالِ غنیمت

کا اصل مالک و متصرف کون ہے۔ وہاں مسلمانوں کو ان کی ہوسناکیوں پر لطیف پیرایہ میں ڈانٹ دی ہے۔ اور ان کو قلب و نظر کی اصلاح کی جانب متوجہ کیا ہے۔ اور پھر بندۂ مومن کی وہ صفات ذکر کی گئی ہیں جن سے اسکے مقصدِ اعلیٰ کا انکشاف ہوتا ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالُ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔

(الانفال)

آپ سے اموال غنیمت کی نسبت پوچھتے ہیں۔ آپ ان سے کہدیں کہ یہ اموال اللہ اور رسول کے لئے ہیں۔ پس تم اللہ سے ڈرو۔ اور اپنے معاملاتِ باہمی (اجتماعی سسٹم) کی اصلاح کرو۔ اور خدا و رسول کی اطاعت کرو۔ اگر تم سچے مومن ہو۔ بجز اسکے نہیں کہ مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا نام لیا جائے تو انکے دل ڈرنے لگیں۔ اور جب اسکی آیات ان پر پڑھی جائیں تو انکے ایمان کو بڑھادیں۔ اور وہ اللہ پر توکل کرتے ہوں وہ جو نماز قائم کرتے ہیں۔ اور ہم نے جو کچھ ان کو دیا ہے اس سے خرچ کرتے ہیں۔ یہی لوگ حقیقت میں سچے مومن ہیں۔ انکے لئے اپنے رب کے ہاں بہت درجے ہیں۔ مغفرت ہے۔ اور باوقار معیشت ہے۔

آپ نے دیکھا؟ کہ ان آیات میں چند مسلمانوں کی معمولی سی لغزش کو (زمانۂ حال کی نظر میں معمولی ہے ورنہ حقیقت میں معمولی نہیں ہے) ایمان کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ اور اشاروں میں یہ بتا دیا کہ مومن کی یہ شان نہیں ہے۔ جو ابھی ابھی تم نے دکھائی ہے۔ مومن اور زر و مال کی ہوس؟ یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ یاد رکھو کہ تم ابھی شیوۂ عاشقی میں پختہ کار نہیں بن سکے ہو۔ حرص و لالچ کے بت اب بھی تم نے اپنے دلوں کی پہنائیوں میں چھپا رکھے ہیں۔ اب ان بتوں کو توڑنا ہوگا۔ اور قلب و نظر کی اصلاح کرنی ہوگی۔

باش مانند خلیل اللہ مست ہر کہن تبخانہ را باید شکست
مومن از عزم و توکل قاہر است گر ندارد ایں دو جوہر کافر است

غزوۂ احد میں جو افسوسناک واقعہ پیش آیا قرآن حکیم نے اسکو حسین و بلیغ انداز میں ذکر کیا ہے۔ اور مسلمانوں کے نقصانِ عظیم کی ذمہ داری ان لوگوں پر عائد کی ہے جن کو آنحضرت صلعم نے ایک خاص مقام پر متعین فرمایا تھا۔ اور انہوں نے غنیمت کے شوق میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے سچا کر دکھایا اپنا وعدہ جبکہ تم دشمنوں کو کاٹ رہے تھے۔ اسکے حکم سے یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی۔ اور رسول میں جھگڑا کیا۔ اور نافرمانی کی تم نے اسکے بعد کہ اللہ تعالیٰ تم کو وہ

ومنکم من یرید الاخرۃ ۔ ثم صرفکم عنھم لیبتلیکم ولقد عفا اللہ عنکم و اللہ ذو فضل علے العالمین۔	چیز دکھا دی تھی، جسکی تم خواہش رکھتے تھے ۔ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کی خواہش کرنے لگے اور کچھ آخرت کی ۔ پھر اللہ تعالےٰ نے تمکو کفار سے ہٹا لیا تاکہ تمہارا امتحان کرے
(آل عمران)	پھر اللہ تعالےٰ نے تمہاری لغزش کو معاف کیا اور اللہ تعالےٰ جہان والوں پر فضل کرنیوالا ہے۔

غزوہ بنی المصطلق میں ایک مہاجر اور انصاری کسی بات پر لڑ پڑے ۔ مہاجر نے انصاری کو پیٹا ۔ اس پر انصاری نے مدد طلب کی اور مہاجرین نے مہاجرین کو پکارا آنحضرت صلعم نے "یاللانصار" اور "یاللمہاجرین" کی آواز سنی تو فرمایا "ما بال دعوی جاھلیۃ" یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو پیٹا ہے ۔ اس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا ۔

دعوھا فانھا خبیثۃ (بخاری) اس نعرہ کو چھوڑ دو کہ یہ ناپاک نعرہ ہے

غزوۂ حنین میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا آنحضرت صلعم نے کچھ نومسلموں کو اموالِ غنیمت سے زیادہ حصّہ دیا ۔ اس پر انصار کے کچھ نوجوانوں نے کہدیا ۔

انّ سیوفنا لتقطر من دماء قریش وغنائمنا ترد علیھم	ہماری تلواروں سے ابتک قریش کا خون ٹپک رہا ہے ۔ اور اب ہمارا حصّہ بھی انکو
(بخاری)	دیا جا رہا ہے ۔

آنحضرت صلعم نے جب یہ بات سُنی تو آپ نے انصار کو بلایا ۔ اور ان سے دریافت فرمایا کہ تم نے یہ بات کہی ہے؟ انصار نے شرم وندامت کے

لہجہ میں عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے جو کچھ سنا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ لیکن ہم میں سے چند نوجوانوں نے یہ بات کہی ہے۔ اس پہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پرجوش خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس سے انصار پہ ایک رقت کا عالم طاری ہوگیا اور وہ مارے شرم کے سر اونچا نہ کر سکتے تھے۔

مدینہ منورہ میں بھی ایک دو دفعہ اس قسم کا واقعہ پیش آیا۔ مگر عہدِ رسالت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ایسے مواقع پہ سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلّم کی مقدس شخصیت آگے آجاتی تھی۔ اور آپ کی نگاہِ انقلاب آفریں سے دلوں کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ ؎

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

یعنی آنحضرت صلعم کی وجہ سے یہ عارضی نفرت و کدورت چند لمحوں ہی میں محبت و اخوت میں بدل جاتی تھی۔ اور یہ بات اس عظیم الشان ہستی کے لئے کچھ مشکل نہ تھی۔ جس نے صدیوں کی عداوتیں چند دنوں ہی میں ختم کر دی تھیں۔ اور ان میں دینی مواخات کا ایک وسیع تر اور محکم تر رشتہ قائم کر دیا تھا۔ بنا بریں زمانۂ رسالت ملتِ اسلامیہ کا خالص تعمیری اور ارتقائی دور تھا۔ اور اس دور میں ملت اسلامیہ ہر قسم کے تخریبی رجحانات سے پاک تھی۔

عہدِ خلافتِ راشدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنو ساعدہ میں مسلمانوں کے انتخابی اجتماع میں

ایک دفعہ پھر انصار و مہاجرین کی تفریق منظر عام پر آئی۔ مہاجر اپنے تئیں خلافت کا حق دار سمجھتے تھے۔ اور انصار اپنی جگہ مدعی خلافت تھے اور حباب بن منذر انصاری نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ایک امیر تم میں سے اور ایک ہم میں سے ہونا چاہئے۔ دوسری طرف سیدۃ النسا حضرت فاطمہ کے مکان پر ہاشمی خاندان کے سرکردہ افراد کا اجتماع تھا۔ اور وہ خلافت کو اپنے خاندان کے لئے مخصوص تصور کرتے تھے۔ غرضکہ یہ مرحلہ امت کیلئے بڑا ہی کٹھن تھا۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ملت کا شیرازہ اس ابتدائی مرحلہ پر ہی پارہ پارہ ہونے والا ہے۔ مگر اس نازک حالت میں اعلیٰ درجہ کا مومنانہ عزم رکھنے والی دو شخصیتیں موجود تھیں۔ جنہوں نے اپنی عدیم النظیر فراست و تدبر سے امت کو اختلاف و انتشار سے بچا لیا۔ میری مراد ان دو شخصیتوں سے صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہیں۔ بالآخر صدیق اکبر کو اتفاق رائے سے خلیفہ چن لیا گیا۔ مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ تینوں گروہ اگرچہ استحقاقِ خلافت کے مدعی تھے لیکن چونکہ ان کے دل ایمان و یقین سے منور تھے۔ اس لئے وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ ملت کا شیرازہ انکے ہاتھوں سے بکھر جائے۔ چنانچہ ملت کی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے انہوں نے جلد یا بدیر حضرت صدیق اکبر کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس سلسلہ میں حضرت علی مرتضیٰ کے خلوص و ایثار پر جتنا فخر کیا جائے کم ہے۔ کہ باوجود اسکے کہ وہ اپنے تئیں خلافت کا اہل تصور کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ بھی اُن کا ہمنوا تھا۔

اگر وہ چاہتے تو ایک جُداگانہ متوازی حکومت قائم کر سکتے تھے۔ یا کم از کم دوسروں کے لئے مشکلات پیدا کرنا ان کے لئے کچھ بھی مشکل نہ تھا لیکن انہوں نے محض اسلئے ایسا نہیں کیا۔ کہ انکی وجہ سے اتحادِ ملت کو کسی طرح کا نقصان نہ پہونچے۔ ابو سفیان جیسے سیاست کار انکی حمایت میں تلوار اُٹھانے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ ابو سفیان نے واشگاف الفاظ میں یہ کہہ دیا تھا۔ کہ اے علی! اگر تم چاہو تو مدینہ میں ایک آدمی کو بھی زندہ نہ رہنے دونگا۔ اور مدینہ کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہا دونگا۔ مگر اس مردِ فقیر نے صاف جواب دے دیا۔ میں خلافت و امارت کے لئے امت کے انتشار کا باعث نہ بنوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ فاتحِ خیبر کے دوسرے فضائل و مناقب کچھ کم نہیں ہیں۔ لیکن میرے نزدیک ان کی عظمتِ شان کی سب سے بڑی سند یہ ہے کہ انہوں نے آخر تک مرکزِ اسلامی کی اطاعت سے انحراف نہیں کیا۔ حالانکہ انکی نظر میں انکے پیش رو تینوں خلفاء خلافت کے حقدار نہ تھے۔ اگر وہ چاہتے تو بہت کچھ کر بھی سکتے تھے۔

بہر حال یہ ابتدائی مرحلہ خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ اور پوری امت نے ایک ایسی شخصیت پر اتفاق کر لیا۔ جو فی الواقع اس منصب کے لئے موزوں تھی۔ اس عہد میں مانعین زکوٰۃ اور مسیلمہ کذاب کے فتنے ضرور اُٹھے۔ لیکن چونکہ مسلمانوں کا نظمِ اجتماعی نہایت مستحکم تھا۔ اور تمام انصار و مہاجرین خلوصِ قلب اور کامل یکجہتی سے فریضہ دفاع امت میں سرگرم تھے۔

اسلئے یہ فتنے اُٹھتے ہی دب کے رہ گئے۔

حضرت صدیق اکبر کے بعد ایک دوسرا مردِ خدا بھی مسلمانوں میں موجود تھا جس کی ذات میں خدائے قدوس نے بیشمار صلاحیتیں پیدا کی تھیں۔ اور اگر دیکھا جائے تو صدیق اکبر کے عہد خلافت میں بھی اس جلیل القدر ہستی کی خداداد بصیرت و فراست اور حیرت انگیز قوت انتظامی بڑی حد تک کارفرما تھی۔ انہوں نے اپنے زمانہ خلافت میں جس بے نظیر عزم و تدبر کے ساتھ حکومت کا کاروبار چلایا اسکی مثال آج تک دنیا نے نہیں دیکھی۔ حضرت عمرؓ کی ذات دشمنانِ ملت کے مقابلہ میں شمشیرِ برہنہ تھی۔ اور دنیا کی تمام چھوٹی بڑی طاقتیں ان سے لرزاں اور خائف تھیں۔ اور جب تک آپ زندہ رہے کسی اپنے یا بیگانے کو سر اُٹھانے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مگر جب یہ جلیل القدر ہستی دنیا سے اُٹھ گئی تو سوئے ہوئے فتنے یکلخت جاگ اُٹھے۔ اور اس مصیبتِ عظمیٰ کا وقت آپہونچا جسکی نسبت خود سردارِ دوجہاں فرما گئے تھے کہ میری امت میں سمندر کی طرح ایک ٹھاٹھیں مارنے والا فتنہ برپا ہوگا۔ التی تموج کموج البحر۔ اور اس فتنہ کی راہ میں حضرتِ عمر کا وجودِ گرامی ہی رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ان بینک و بینہما بابًا مغلقًا (قول حذیفہؓ) چنانچہ اس بابِ مغلق کے ٹوٹنے کے بعد یہ فتنہ اس طرح اُمڈا کہ آج تک اس کی تباہ کاریوں سے امت کو نجات نہیں مل سکی۔ ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرًا۔ یہ فتنہ کیا تھا۔ کیا باہر سے کوئی آفت ناگہانی طور پر

آ گری تھی۔ یا خود امت کے اندر یہ فتنہ پرورش پا رہا تھا۔ اس کا جواب ممکن ہے کہ بہت لوگوں کو اجنبی معلوم ہو۔ مگر جو حقیقت ہے وہ کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی محتاج نہیں ہے۔ وہ ہر حال میں قائم و دائم ہوتی ہے۔ اور کبھی نہ کبھی اپنی صداقت تسلیم کرا ہی لیتی ہے۔ ؎

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

در اصل حضرت عثمانؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد ملکی سیاست میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، جن کا سلجھانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ خاندانِ بنی ہاشم پہلے ہی سے خلافت کو اپنا موروثی حق تصور کرتا تھا۔ اور انکی نظر میں دوسرے لوگ غاصب تھے۔ حضرت علیؓ کی وسعتِ قلب ونظر اور صدیق و عمر کی اعلیٰ انتظامی قابلیتوں کی وجہ سے انکو پہلے اپنے ارادوں کی تکمیل کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انکے لئے راستہ صاف ہو گیا۔ اور دیرینہ خاندانی رقابت کو اُبھرنے کا موقع مل گیا۔ حضرت عثمانؓ اگرچہ انتہائی درجہ کے نیک سیرت پاک طینت اور صالح انسان تھے۔ مگر انکی سیاسی حکمت عملی دور اندیشانہ نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ فاروق اعظم کی طرح کا رعب داب رکھتے تھے۔ چنانچہ انکی سادگی اور نرمی سے نئی پود کو فائدہ اُٹھانے کا موقع مل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ نئی پود مسلمانوں کے گھرانے سے تعلق ضرور رکھتی تھی۔ اور ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ لوگ نیک بھی ہوں۔ مگر جس چیز کا پچھلے سطور میں ذکر کیا گیا ہے۔ (یعنی اسلام کے اصل نصب العین سے گہری عقیدت) وہ ان میں موجود نہ تھی۔ اور اسکی جگہ ان میں

قبیلوی اور خاندانی عظمت و وقار کا جذبہ ضرور موجود تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ایک بڑی جماعت صحابہ کرام کی موجود تھی۔ مگر انکی ایک بڑی تعداد شام و فلسطین وغیرہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو ارضِ حجاز میں موجود تھے۔ ان میں کچھ لوگ خاندانِ بنو ہاشم سے عقیدت رکھتے تھے۔ کچھ الگ تھلگ غیر جانبدارانہ مسلک رکھتے تھے۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جو حضرت عثمانؓ کی کمزور حکمتِ عملی سے مطمئن نہ تھے۔ غرضکہ ملت اسلامیہ کے اندر ہی کچھ ایسے اسباب پیدا ہو چلے تھے جن کا پہلا حملہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ بہرحال سطور بالا سے یہ سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ سب سے پہلے ملت اسلامیہ میں جو فساد و اختلال رونما ہوا اسکے نفوذ کی راہ خاندانی اور نسلی رقابت و عصبیت تھی۔ اور اسی عہد کو فسادِ اُمت کا نقطۂ آغاز تصور کرنا چاہیئے۔

امت کا دورِ تنزل

ہر تاریخی واقعہ اپنا ایک ذہنی پس منظر رکھتا ہے جو اس واقعہ کی خارجی تشکیل سے پہلے تکمیل کے مختلف مدارج طے کر رہا ہوتا ہے۔ اور ایک خاص تناسب سے وہ خارجی ماحول پر اثر انداز ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ تکمیلی مدارج طے کرنے کے بعد معاشرہ کے تمام عملی گوشوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر اگر ہم کسی مخصوص واقعہ کو مسلمانوں کی تخریب و انتشار اور فساد و تنزل کا سبب قرار دینگے تو وہ یقیناً غلط ہوگا۔ اسلئے یہ کہنا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے افسوسناک واقعہ سے امت میں انتشار رونما ہوا، صحیح نہیں ہے۔ بلکہ

دیکھنا یہ ہے کہ اس المناک سانحہ کے پس پردہ کون سے ذہنی عوامل کارفرما تھے
ہاں یہ صحیح ہے کہ اس عالم ہست و بود میں ایک واقعہ کئی دوسرے واقعات
کا سبب بن سکتا ہے۔ اور جس طرح ذہنی کائنات اسباب و علل کی آماجگاہ
ہے۔ اسی طرح خارجی ماحول بھی اسباب و علل کی طویل داستان ہے۔
اور بادی النظر میں شہادت عثمانؓ کے واقعہ کے بعد ہی مسلمانوں میں دو
مستقل پارٹیاں پیدا ہوئیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک پارٹی نے شہادت
عثمانؓ کے واقعہ کو محض پولٹیکل سٹنٹ کے طور پر استعمال کیا۔ اور اسکی تہ
میں دیرینہ نسلی رقابت اور ہوس اقتدار ہی کارفرما تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ
اسلام میں اتحاد و مرکزیت کو جو اہمیت حاصل ہے اسکے پیش نظر اسلام
کسی فرد یا جماعت کو اس امر کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی معمولی یا غیر معمولی
واقعہ کو سامنے رکھکر اسلامی مرکزیت کو پارہ پارہ کر دے۔ اور مستقل طور پر
اُمت کے نظام اجتماعی میں انتشار و طوائف الملوکی کا دروازہ کھول دے
یہ صحیح ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کا واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا جسکو
یونہی نظر انداز کر دیا جاتا۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ ملت کی سیاسی
وحدت کو قائم رکھنا اس سے بہت زیادہ اہم اور ضروری تھا۔ اور کون
کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ اور انکی پارٹی کے لوگ اسلام کی ان مسلمہ
حقیقت سے بے خبر تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ ان کو ملت کے عمومی مفاد کے
احترام پر مجبور کرنے والا جذبہ اب کمزور پڑ گیا تھا۔ اور اب ان کے دل
مفاداتِ جزئیہ سے اس درجہ متاثر تھے کہ مفادِ کلی کے احساس کا ان میں

بہت کم حصہ باقی رہ گیا تھا۔

حضرت علی مرتضیٰ کو انصار و مہاجرین کے اصحاب حل و عقد نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور آئینی حیثیت سے ان کی خلافت بالکل حق بجانب تھی اس بنا پر تمام مسلمانوں کا مذہبی اور اخلاقی فرض تھا کہ بلا حیل و حجت انکی اطاعت کرتے اور اگر کسی کو انکے سیاسی یا غیر سیاسی طرز عمل سے اختلاف تھا تو اسکی اصلاح بجز اسکے ممکن ہی نہ تھی کہ مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے خلیفہ کو اسکے طرزِ عمل کی تبدیلی کے لئے مجبور کیا جاتا۔ یعنی اگر امیر معاویہؓ کی جماعت کا حقیقی مقصد اتنا ہی تھا کہ قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص لیا جائے تو اس مقصد کے لئے اگر وہ مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے جدوجہد کرتے تو کامیابی کا زیادہ امکان تھا۔ لیکن امیر معاویہ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے نہ صرف یہ کہ وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہے بلکہ مرکزیت اسلامیہ کو بھی درہم و برہم کر دیا۔ ان حقائق کے پیش نظر اس بات کے اظہار میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ شریعت اسلامیہ کی نظر میں ملت کے انتشار کی ذمہ داری حضرت معاویہؓ پر عائد ہوتی ہے۔

اس بات کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں ہے کہ حضرت علیؓ ذاتی طور پر ماہر سیاست داں تھے یا نہ تھے۔ یا ان سے کچھ سیاسی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں یا نہیں! اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ حضرت عمرؓ کی طرح اعلیٰ پایہ کی سیاسی بصیرت اور انتظامی قابلیت نہ رکھتے تھے۔ یا گورنروں کی معزولی کے عاجلانہ اقدام اور دار الخلافہ کو کوفہ میں منتقل کرنے میں انہوں نے

سیاسی غلطی کا ارتکاب کیا تھا۔ پھر بھی یہ بات بجائے خود ایک حقیقت ثابتہ کا درجہ رکھتی ہے۔ کہ اب مسلمانوں کی ذہنی اور فکری حالت خلافت راشدہ کے ابتدائی دور جیسی نہ تھی۔ اور اس وقت کا سیاسی ماحول بھی حضرت صدیق رض اور حضرت عمر رض کے زمانہ سے بالکل مختلف تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے بہترین اہل فکر کا مخلصانہ تعاون حضرت علی رض کی ذاتی کوتاہیوں کی کما حقہٗ تلافی کر سکتا تھا۔ اور کتاب و سنت کے صریح احکام کے پیش نظر مسلمانوں کو یہی راہ عمل اختیار کرنی چاہیئے تھی۔[1] کہ وہ کامل یکجہتی اور غیر متزلزل عزم کے ساتھ مرکز ملت کی اطاعت کرتے۔ اور اتحاد ملت کی خاطر تمام ذاتی اور قبیلوی مفادات کو نظر انداز کر دیتے۔ مگر سخت افسوس ہے کہ ان کی غیر اسلامی روش نے ملت اسلامیہ کو ہمیشہ کے لئے فتنہ و فساد کی آگ میں جھونک دیا۔

وما کان قیس هلکهٗ هلك واحدٍ۔ ولکنه بنیان قومٍ تهدّما۔

اور پھر انہوں نے دعوائے خلافت پر ہی اکتفا نہیں کی۔ بلکہ حضرت علی رض کے خلاف لوگوں کو اکسانے میں انتہائی کوشش کی۔ اور ایک عرصہ تک ان دو جماعتوں میں معرکہ ہائے قتال بپا رہے۔ یہ بات ناقابل انکار ہے کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کی باہم رقیبانہ کشاکش و آویزش اسلام کی نظر میں بہت بڑا جرم ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے ہر ایسے گروہ کے خلاف جنگ و قتال کا حکم دیا ہے۔ جو مرکز اسلامی کے خلاف آمادہ بغاوت ہو۔ نیز ان

---

[1] آئندہ چل کر اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائیگی۔ ۱۲

سیاسی ہنگاموں میں حضرت امیر معاویہ کی طرف سے جس قسم کی سیاسی حکمت عملی (ڈپلومیسی) اختیار کی گئی وہ کسی لادینی نظام سیاست میں تو کھپ سکتی ہے۔ لیکن اسلام کی سیاست عادلہ میں اسکے لئے قطعاً گنجائش نہیں ہے مثلاً واقعۂ تحکیم ہی کو سامنے رکھئے۔ اس میں کس طرح قرآن کریم کو محض سیاسی مقصد برآری کے لئے استعمال کیا گیا۔ یعنی جب وہ مخالف گروہ کی فاتحانہ یلغار کو قوت بازو سے روکنے میں ناکام رہے تو قرآن حکیم کو سامنے لاکر اعلان کیا کہ آؤ ہم اور تم اسکے مطابق فیصلہ کرلیں۔ لیکن ان کے دل میں کچھ اور ہی تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طے شدہ سازش کے ماتحت تحکیم کا سہارا لیا۔ اور اس میں حضرت عمرو بن العاص نے جو سیاسی چال چلی، وہ ایک صحابی رسول تو کیا کسی معمولی مسلمان کو بھی زیب نہیں دیتی۔ چنانچہ اس واقعہ سے کچھ جلیل القدر صحابہ مثلاً ابو موسیٰ اشعری اسدرجہ متاثر ہوئے کہ وہ سیاسی ہنگامہ آرائیوں کو چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشیں ہو گئے۔

جب کسی قوم میں ملی اور اجتماعی احساس مفقود ہو جاتا ہے تو اسکے ساتھ دیانت، صداقت اور تمام اچھی صفات رخصت ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اس کا ہر قدم ہلاکت و بربادی کی جانب اُٹھتا ہے۔ چنانچہ واقعہ تحکیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے مسلمانوں میں صرف دو ہی فرقے تھے۔ اب ایک تیسرا خطرناک فرقہ (خوارج) بھی معرض وجود میں آگیا۔ جو آنے والے دور میں مسلم حکومتوں کے لئے زبردست خطرہ بنا رہا۔

اذا کان خیر اللہ للمرء عدلۃ — اتتہ الرزایا من وجوہ الفوائد

تاریخِ زوالِ امت کا دوسرا دور

دولت بنی اُمیہ کا بنیادی پتھر حضرت معاویہ نے رکھا تھا۔ اور جس عمارت کی بنیاد کا یہ عالم ہو اسکے بام و در کی پختگی کا خود ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ع جسکی بہار یہ ہو اسکی خزاں نہ پوچھ

حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کی جگہ حضرت امام حسنؓ کو خلیفہ منتخب کیا گیا۔ مگر وہ از خود منصب خلافت سے سبکدوش ہو گئے۔ اور اس طرح ان کے اس دانشمندانہ اقدام نے اسلامی مرکزیت کو انتشار سے بچا لیا حق یہ ہے کہ انسان کی عظمت کا راز اسکے اخلاقی اور عملی کردار ہی میں مضمر ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس بات میں ابن رسول سے کون سبقت لے جا سکتا ہے؟ اور پھر ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ انکے نانا حضرت احمد مجتبیٰ صلے اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے۔

ابنی ھذا سید ولعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتین من المسلمین۔ (بخاری)

میرا یہ بیٹا سردار ہے۔ اور شاید کہ اسکے ذریعہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں مصالحت ہو جائے۔

حضرت امام کے اس عدیم النظیر ایثار نے ملت کو اتنا فائدہ ضرور پہنچا دیا کہ اس سے پہلے مسلمانوں کے دو جدا جدا مرکز تھے۔ اور اب تمام مسلمان ایک ہی مرکز کے ماتحت آ گئے۔ مگر حضرت معاویہ اگر اسلامی مرکزیت کو نسلی عظمت و تفوق کا ذریعہ نہ بناتے اور خلافتِ راشدہ کی طرح نظامِ شوریٰ کے تحت حکومت کا کاروبار چلاتے تو آج اُن کو بھی خلفاءِ راشدین کی طرح

عقیدت و احترام سے یاد کیا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اسلامی جمہوریت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا۔ اور اس سے ملت کے نظام اجتماع میں بے شمار مفاسد کے نفوذ کے لئے ایک دوسرا رخنہ پیدا ہو گیا۔ یعنی اس سے پہلے نسلی شعور کی راہ سے فساد و اختلال داخل ہوا تھا۔ اور اب اس شعور نے اپنی پشت پناہی کے لئے اقتدارِ ملوکیت کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اس طرح اب وہ ناقابلِ شکست قوت کا مالک بن گیا۔

جب کوئی نیا تصورِ زندگی معرضِ وجود میں آتا ہے۔ تو وہ اگرچہ ابتدا میں بظاہر منفرد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن درحقیقت وہ اپنے تمام متعلقات و لوازمات کو ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے زمانہ میں مطلق العنانہ طرزِ حکومت کے مفاسد نے ملت پر اس طرح ہجوم نہیں کیا تھا جس طرح ان کے بعد انتہائی شدت کے ساتھ جسمِ ملت میں سرایت کرتے چلے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دن امت کے لئے منحوس ترین دن تھا جبکہ اسلام کے مقدس نظام شورٰی کی جگہ نظام شاہی کی بنیاد پڑی۔ اس المناک سانحہ سے انسانیت دم بخود رہ گئی ہو گی اور حضرت محمد مصطفٰے صلعم کی روح کانپ اُٹھی ہو گی۔ کیونکہ اس واقعہ نے امت مسلمہ کے طرز فکر و عمل کو ایسے رخ کی جانب پھیر دیا۔ کہ وہ ابد الاباد کے لئے صحیح فکرِ اسلامی سے محروم ہو گئی ظاہر ہے کہ اس سے بڑا المناک سانحہ امتِ محمدیہ کے لئے کیا ہو سکتا ہے؟

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔ — قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں (آیہ) زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر پڑیں

حضرت امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولیعہد بنایا۔ اور اسکی بیعت کا کام اپنی زندگی ہی میں مکمل کیا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جس قسم کے کردار کا مظاہرہ کیا اسکے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے اس مقام شرف کو رسوا کر دیا جو صحابی رسول ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت عبداللہ بن زبیر، عبدالرحمان بن ابی بکر نے جانشینی اور ولیعہدی کے خلاف آواز بلند کی۔ اور ان حضرات نے صاف کہدیا کہ تم صدیقؓ و عمرؓ سے بہتر نہیں ہو۔ اور تمہارا بیٹا ان کے بیٹوں سے افضل نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو نامزد نہیں کیا۔ اور تمہیں بھی ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ مگر امیر معاویہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بجز اُس جواب کے جو ہمیشہ ایسے مطلق العنان حکمرانوں کی طرف سے اہل حق کو دیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پورے جلال کے ساتھ ان حضرات سے کہدیا کہ اگر تم اب اس معاملہ میں زبان کھولو گے تو سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اور پھر مسلمانوں کے اجتماع میں آکر لوگوں کو یوں مخاطب کیا کہ اے لوگو! ابن عمرؓ ابن ابو بکرؓ اور ابن الزبیرؓ آج مسلمانوں میں سب سے زیادہ لائق احترام ہیں۔ اور انہوں نے یزید کی بیعت کر لی ہے۔ یہ تینوں حضرات پاس ہی سُن رہے تھے۔ مگر خطرۂ جان کی وجہ سے بول نہ سکتے تھے۔ بعد میں مسلمانوں نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا ہم نے یزید کی ابتک بیعت نہیں کی۔ لیکن خطرۂ جان کی وجہ سے ہم بول نہ سکتے تھے۔

اب ہر شخص خود ہی اندازہ کر سکتا ہے کہ حضرت امیر معاویہ جیسا شخص سیاسی اغراض کے لئے لوگوں کو اتنا بڑا فریب دے سکتا ہے تو بعد میں آنے والے امراء و سلاطین کی کیا حالت ہوگی؟ اور اگر ان امراء نے بعد میں خاندان بنی ہاشم اور دیگر اہل علم و تقویٰ پر لرزہ خیز مظالم ڈھائے اور انسانیت سوز اعمال کا ارتکاب کیا تو یہ کوئی خلاف توقع بات نہ تھی کیونکہ مطلق العنانہ طرزِ حکومت سے جبر و تشدد، غصب حقوق، کنبہ پروری عیاشی، بد دیانتی، اور مکر و فریب کے سوا کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ امیر معاویہ کے بعد یہ تمام مفاسد و معائب نکھر کر سامنے آگئے۔

تجدید و اصلاحِ دین کی ایک کوشش

یہ نہیں ہو سکتا کہ رات کی تاریکی ہمیشہ کے لئے چشم انسانی کو شعاعِ آفتاب سے محروم رکھے۔ اور فسق و معصیت کی تیرہ و تار گھٹائیں تا ابد رشد و ہدایت کی نورانی کرنوں پر چھائی رہیں۔ یہاں روز اول ہی سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ جب رات کی تاریکی حد کمال کو پہنچ جاتی ہے تو یک لخت ہی نور سحر کی نمود ہوتی ہے۔

چنانچہ اسلامی تاریخ میں بھی آج تک یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے۔

سلیمان بن عبد الملک نے زندگی بھر میں کوئی اچھا کام کیا ہوگا یا نہیں اور دنیا جانتی ہے کہ اس اموی حکمران نے محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم ایسے جری اور نامور اسلامی جرنیلوں کو بے گناہ قتل کرا دیا تھا۔ مگر یہ بات کس قدر حیران کن ہے کہ اس نے مرنے سے پہلے بنو امیہ کے عام دستور کے

خلاف اپنے بیٹے کے بجائے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنا جانشین بنایا جنہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو نظامِ شاہی کی گرفت سے نکالا۔ اور از سرِ نو اسلام کے نظامِ شوریٰ کو بحال کیا۔ اور پھر آپ نے ان تمام مفاسد کی اصلاح کے لئے مؤثر قدم اٹھایا۔ جو ان کے پیشرو حکمرانوں کی ہوسناکیوں نے اسلامی معاشرہ میں پیدا کئے تھے۔

مجدّدِ ملت عمر بن عبدالعزیز کا سیاسی نقطۂ نظر دیگر اموی سلاطین وامرأ سے بالکل مختلف تھا۔ یعنی دوسرے حکمرانوں کی تمام تر جد و جہد فتح ممالک اور توسیع مملکت کے لئے تھی۔ چنانچہ ان کے عہد حکومت میں بلاد افریقہ، اسپین، اور سندھ وغیرہ ممالک مسلمانوں نے فتح کر لئے تھے۔ اور قسطنطنیہ پر بھی کئی دفعہ چڑھائی کی گئی۔ جس میں ہر دفعہ ناکامی ہوتی رہی مگر حضرت مجدّدِ اوّل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فتح ممالک کی نسبت قلوب واذہان کی دنیا کی تسخیر زیادہ اہم تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کا فکر و ذہن غیر اسلامی رہیگا ممالک کی تسخیر سے اسلام کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی پوری توجہ اصلاح وتعمیر ملت کے لئے وقف کر دی۔ اور سب سے پہلے انہوں نے اپنی ذات اور اہل خاندان سے اصلاحی پروگرام کی ابتدا کی۔

حق یہ ہے کہ خدائے قدوس کو اس مردِ مومن سے تجدیدِ ملت کا کام لینا تھا۔ اور اس میں وہ تمام صفاتِ کمال موجود تھیں جو منصب تجدید و احیاء دین کے لئے ناگزیر ہیں۔ ان کی ذات فقر و شاہی کے دوگونہ وارداتِ

وکمالات میں ذاتِ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی تجلیات کا عکس تھی۔

خسروی شمشیر در درویشی نگاہ — ایں دو گوہر از محیطِ لا الٰہ
فقر و شاہی واردات مصطفےٰ ست — ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفےٰ است

غرض عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے ڈھائی سالہ دورِ حکومت میں اتنا کچھ کر دکھایا کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ان کے بعد امراءِ بنی امیہ میں ان جیسا کوئی باشعور اور دور اندیش حکمراں نہ پیدا ہو سکا۔ اور از سرِ نو مطلق العنانہ نظام حکومت مسلمانوں پر مسلّط ہو گیا۔

اعتقادی تحزب و فراق نسلی عصبیت یا عصبیت جاہلیہ تو پہلے سے کم و بیش تھی۔ لیکن حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ایک جدید عقیدہ و مسلک رکھنے والے شیعی فرقہ نے جنم لیا اور واقعہ تحکیم کے بعد ایک تیسرا مذہبی گروہ (خوارج) بھی پیدا ہو گیا۔ اور پھر اول الذکر فرقہ سے کئی اور فرقے پیدا ہوئے۔ مثلاً فرقہ باطنیہ اور توابین وغیرہ! یہ مذہبی فرقے ایک دوسرے کے خلاف شدید تعصب اور اختلاف رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ہر فرقہ دوسرے کو کافر اور مرتد قرار دیتا تھا۔ اپنے عقائد کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ہر ایک فرقہ نے کتاب و سنت کا سہارا لیا۔ اور اس طرح مسلمانوں کی دینی اور اعتقادی وحدت کو ان فرقوں کے اختراعی تصورات نے شدید نقصان پہنچایا۔

ان فرقوں کی حیثیت صرف مذہبی ہی نہ تھی۔ بلکہ وہ جدید دعوت کے

ذریعہ اموی حکومت کا تختہ اُلٹنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان لوگوں نے سیاسی انقلاب بپا کرنے کی لگاتار کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ اور بالآخر ابومسلم خراسانی کی پراسرار دعوت نے اموی حکومت کا خاتمہ کیا اور ۱۳۲ھ میں بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی۔

تاریخِ زوالِ اُمّت کا تیسرا دور

اسلامی تاریخ کے ہر نئے دور میں دورِ ماضی کے مفاسد کے علاوہ کوئی نہ کوئی نیا فتنہ بھی سر اُٹھاتا رہا ہے۔ چنانچہ عباسیوں کے عہدِ حکومت میں نسلی عصبیت ملوکیت اور اعتقادی تعصب، وافتراق کی تباہ کاریاں بدستور موجود رہیں اور ان کے علاوہ ایک جدید فتنہ کا آغاز ہوا۔ یہ نیا فتنہ عقلیت پرستی یا "ذہنی مرعوبیت و کمتری" کا تھا۔ جس نے مسلمانوں کے رہے سہے فکری سرمایہ کو بھی ختم کر دیا۔[1]

دورِ بنی امیہ میں اور تمام برائیاں موجود تھیں۔ مگر اتنی بات ضرور تھی، کہ علماء وقضاۃ کو تقریر و تحریر کی آزادی حاصل تھی۔ اور وہ کھلے بندوں امراء و سلاطین کے غیر شرعی اعمال پر نکتہ چینی کر سکتے تھے۔ مگر عباسی دورِ حکومت میں حریتِ فکر و رائے پر بھی پہرے بٹھا دیئے گئے۔ اور علمبردارانِ کتاب وسنت کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ اور اسکے برعکس ایک عقلیت پرست فرقہ (معتزلہ) کو بڑھنے اور پھیلنے کے لئے نہ صرف کھلا چھوڑ دیا گیا۔ بلکہ اسکی ہر طرح سرپرستی کی گئی۔ اس فرقہ ضالہ نے قرآنی عقائد و ایمانیات اور

---

[1] ہم آگے کسی موقع پر امویوں اور عباسیوں کی "علمی خدمات" سے بحث کرینگے۔

احکام و اعمال کو عقل و فلسفہ کے معیار پر پرکھنا شروع کیا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمتِ قرآنی یونانی فلسفہ کے طبعی اور مابعد الطبیعی تصورات کے تہ بہ تہ پردے ڈال دیئے گئے۔ اگر اس زمانہ میں امام احمد بن حنبلؒ امام غزالیؒ امام ابن تیمیہؒ علوم کتاب و سنت کے احیاء کی کوشش نہ کرتے تو اس دور کے عقل پرستوں کی ناپاک کوششیں کامیاب ہو جاتیں۔ مگر جیسے کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اہلِ ہوا اور بانیانِ فساد کے مقابلہ میں علمبرداران علومِ سنت اور اصحاب تجدید دین بھی پیدا ہوتے رہے جنکی مجاہدانہ کوششوں نے ملّت اسلامیہ کے ذہنی سرمایہ کو کم و بیش بچائے رکھا۔

یہ فرقہ ضالہ دولتِ عباسیہ کے ساتھ ہی رخصت ہوا۔ اور آج ہمیں اہل السنت کی کتابوں ہی سے پتہ چلتا ہے کہ معتزلہ کے نام سے کوئی فرقہ ہو گذرا ہے۔ ورنہ اس نام کا کوئی مذہبی یا غیر مذہبی گروہ آج مسلمانوں میں موجود نہیں ہے۔ مگر اس میں شک نہیں ہے کہ ایسے لوگ آج بھی مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ جن کا ذہن "افکارِ غیر" کا محکوم ہے۔ اور وہ اپنے ساتھ قرآن کو بھی مغربی مکاتب فکر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جب قرآن حکیم کی حکمتِ بالغہ سے بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ قرآن حکیم ہیگل، روسو، کارل مارکس، اور دیگر مغربی علماء و مفکرین کے افکار و خیالات کی ترجمانی کے لئے نازل ہوا ہے۔ اور انکے نزدیک قرآن کے نزول کی غرض محض سیاسی عروج و ارتقا کی تکمیل ہے۔ چنانچہ ڈ

ہر قرآنی حکم کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔

جب قوم کے سامنے ذاتی عزت و وقار اور جاہ پرستی کے سوا کوئی پاکیزہ اور ملی نصب العین نہ ہو تو اس سے لامحالہ وحدتِ فکر اور وحدت عمل میں انتشار رونما ہوتا ہے۔ اور گروہی مفادات میں خطرناک تصادم شروع ہو جاتا ہے چنانچہ ملت اسلامیہ نے اپنے اعلےٰ نصب العین کو چھوڑ دیا تو اس میں سب سے پہلے نسلی اور قبیلوی رقابت و عصبیت پیدا ہوئی۔ اور آگے چل کر اس نے تغلب و تسلط کی شکل اختیار کر لی۔ اغراض میں تصادم و کشمکش رونما ہوئی اور ہر گروہ نے اپنے مقصد کی خاطر ایک نئی دعوت اور نیا مسلک پیش کیا جس سے کئی مذہبی فرقے پیدا ہوتے چلے گئے۔ اور پھر آگے جا کر اسلامی تصور زندگی سے مسلمان اسقدر دور چلے گئے کہ انکی نظر اسلامی تصورات اور غیر اسلامی افکار و خیالات میں تمیز ہی نہ کر سکی اور قرآنی مذہب کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔

غرض جب مسلمانوں کے فکر و عمل میں انتہائی درجہ کی لامرکزیت پیدا ہوگئی تو انکی سیاسی مرکزیت بھی پارہ پارہ ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ تیسری صدی کے آواخر میں مسلمانوں کے تین جُدا جُدا مرکز بن گئے۔ عراق، اندلس، اور شمالی افریقہ۔ بغداد آل عباس کا مرکز خلافت تھا۔ اندلس میں امویوں نے۔ اور شمالی افریقہ میں فاطمیوں نے الگ الگ خلافتیں قائم کر لی تھیں۔ اور پھر یہ تین مراکز بھی آگے چل کر کئی چھوٹے چھوٹے مرکزوں میں تقسیم ہو گئے۔ خلافتِ عباسیہ کے صوبائی حکام خود مختار بن گئے اور انہوں نے مرکز سے تعلق منقطع کر لیا۔ اموی خلافت کی وحدت بھی

قائم نہ رہ سکی۔ اور پانچویں صدی میں اندلس کے مغربی اور مشرقی اقطاع میں بنو عباد، بنو مظفر، بنو جہور، بنو حمود، بنو الفری، اور کئی دوسرے خاندانوں کی الگ الگ ریاستیں قائم ہوگئیں۔ اور ان ریاستوں کے حکمرانوں نے اپنے لئے مقتدر باللہ، معتصم باللہ، معتمد باللہ، متوکل باللہ، معتضد وغیرہ کے پر ہیبت القاب تجویز کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس افسوسناک انتشار و طوائف الملوکی کو دیکھ کر اندلس کے مایۂ فخر ادیب ابو علی حسن بن رشیق نے یہ شعر کہے تھے۔

مما یزھدنی فی ارض اندلس ¹   سماع مقتدر فیھا و معتقد

القاب مملکۃ فی غیر موضعھا   کالھرۃ تحکی انتفاخا صولۃ الاسد

اس دورِ انتشار میں اندلس کے شمالی حصہ یعنی بحرِ اعظم سے ملحقہ علاقوں میں بنو مظفر کی حکومت تھی۔ یہ ریاست نسبتاً زیادہ خوشحال تھی اور اسکے حکمران اہل علم کے بہت ہی قدرداں تھے۔ اس زمانہ کے مشہور شاعر و ادیب ابو محمد عبد المجید بن عبدون نے ایک بلند پایہ عربی قصیدہ قلمبند کیا تھا۔ جس میں شاعرِ مذکور نے بنو مظفر کو مخاطب کیا تھا۔ یہ قصیدہ بہت طویل ہے۔ جو کم از کم اسّی اشعار پر مشتمل ہے۔ اسکے چند ابتدائی اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

---

¹ جس چیز نے مجھے ارض اندلس سے متنفر کیا ہے۔ وہ معتمد اور معتقد جیسے ناموں کا سننا ہے۔ یہ سلطنت کے القاب ہیں جو بالکل بے محل ہیں۔ جیسے بلی پھول پھول کر شیر جیسی ہیبت کا اظہار کر رہی ہو۔

الدهر[1] يفجع بعد العين بالاثر — فما البكاء على الاشباح والصور

انهاك انهاك لا آلوك موعظة — عن نومة بين ناب الليث والظفر

فالدهر حرب وان ابدى مسالمة — والبيض والسود مثل البيض والسمر

فی کل حين لها فی کل جارحة — لنا جراح وان زاغت عن النظر

کم دولة وليت بالنصر خدمتها — لم تبق منها وسل ذکراک من خبر

(بحوالہ المعجب)

بالآخر ان پر آزمائش کی وہ گھڑی آ پہنچی جو ایسی غفلت شعار قوموں کے لئے مقدر ہے۔ فما بکت علیھم السماء والارض وما کانوا منظرین۔ آلِ عباس کی خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ تاتاریوں کے ہاتھوں گل ہوا۔ اور ۶۵۹ھ میں دوبارہ مصر میں عباسی خلافت نے جنم لیا جو قریباً تین سو سال تک افتاں وخیزاں چلتی رہی۔ مگر بالآخر ترک حکمران سلیم اوّل نے اسکا بھی خاتمہ کیا اور خلافت اب غیر قریشی خاندان میں منتقل ہو گئی۔

---

[1] زمانہ اشخاص واعیان کے بعد انکی نشانیوں پر ماتم کرتا ہے۔ لیکن اشباح وصور پر رونے سے کیا فائدہ؟۔ میں تجھے بار بار روکتا ہوں (اور میں تجھے نصیحت کرنے میں کوتاہی نہیں کرونگا) شیر کی ڈاڑھوں اور اسکے پنجوں کے درمیان سونے سے۔ بس زمانہ سراپا جنگ ہے اگرچہ وہ بظاہر امن کا اظہار کرے۔ اسکی سفید اور سیاہ چیزیں درحقیقت تلواریں اور نیزے ہیں۔ وہ ہر لمحہ ہمارے جسم کے ہر حصّہ کو زخمی کرتا ہے۔ اگرچہ یہ زخم ہماری نظر سے پوشیدہ ہوں۔ کتنے ممالک ہیں جن کو فتح کرنے کے بعد ان کی خدمت کا کام تجھے سونپا گیا۔ اور اب ان سے کوئی بھی باقی نہیں ہے۔
اور تو اپنی سرگذشت تاریخ سے پوچھ لے۔

بحث کے ابتدائی حصہ میں لکھا جا چکا ہے کہ حکومت و اقتدار کے لئے نظم و اتحاد، شجاعت و تہور۔ اور احساسِ ملی کی ضرورت ہے۔ اور جس قوم یا طبقہ میں یہ صفات موجود ہوں، وہ یقیناً سیاسی اقتدار کا مالک ہوگا۔

ترک انتہائی درجہ کے سخت کوش، جفاکش، دلیر اور جنگ جو تھے، ان میں اعلیٰ درجہ کا نظم و اتحاد تھا۔ دینداری اور سادگی تھی۔ اسلئے وہ مسلسل چھ سو سال تک اقوام دنیا کے قائد رہے۔ مگر ملوکیت جسے "ام المفاسد" کہنا چاہیئے۔ ان میں بھی ابتدا ہی سے موجود تھی۔ اور اسکی وجہ سے تدریجاً ان میں وہ تمام معائب پیدا ہوتے چلے گئے۔ جو ملوکیت کا لازمہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے پہلی حکومتیں تباہ ہوئی تھیں۔

اسی طرح ہندوستان کو شروع میں جن حکمرانوں نے فتح کیا تھا۔ بلاشبہ ان میں نظم و اتحاد، قوت ایمانی، عزم و ہمت موجود تھی۔ مگر یہاں بھی متذکرہ مفاسد تدریجاً پیدا ہوتے گئے۔ اور بالآخر عہد اکبری میں بالکل وہی حالت ہوگئی۔ جو دورِ عباسیہ کی تھی۔ یعنی اس دور میں بھی دین خداوندی کو تختۂ مشق بنایا گیا۔ لادینی اور الحاد نے قوت پکڑ لی۔ اور دوسروں کی ہر ادا حسین معلوم ہونے لگی۔ اس دور میں اصلاح و تجدید دین کے لئے خدائے قدوس نے حضرت سید احمد سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کو پیدا کیا جن کی ضربت کاری نے دینِ الٰہی کے صنمِ اکبر کو پاش پاش کیا۔ ؎

گماں مبر کہ خرد را حساب و میزان نیست نگاہِ بندۂ مومن قیامتِ خرد است

(اقبالؒ)

حضرت مجدد کے بعد بھی مصلحین پیدا ہوتے رہے مگر مسلمانوں کا فساد اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ اصلاحی کوششوں کے باوجود بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ جسمِ ملت کا کوئی حصّہ اسکی زد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور بالآخر یہاں بھی مسیحیت کے ہاتھوں مسلمانوں کی عظمت و شوکت پیوندِ خاک ہو کر رہ گئی۔ وکان امر اللہ مفعولا۔

گذشتہ سطور سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اضافی اسباب میں بنیادی حیثیت رکھنے والے چار اسباب ہیں۔ عصبیّتِ جاہلیہ۔ ملوکیت و آمریت۔ اعتقادی عناد و تعصب اور ذہنی و ثقافتی مرعوبیت۔ تاریخ اسلامی کے ہر نئے دور میں یہ اسباب بدستور موجود رہے ہیں۔ اور یہ بنیادی اسباب مسلمانوں کے ہر طبقہ میں اسکی مخصوص ذہنی ساخت اور ماحول کے مطابق نئے نئے مفاسد کی تخلیق کرتے رہے ہیں۔

ذہنی مرعوبیت و تاثر کو تاریخی اعتبار سے چوتھے نمبر پر رکھا گیا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عہد عباسیہ سے پہلے یہ سبب فساد موجود ہی نہ تھا۔ در اصل غور سے دیکھا جائے تو نسلی عصبیت اور ملوکیت و آمریت بھی تو غیر اسلامی رجحانِ فکر کی پیداوار ہیں۔ اور اس لحاظ سے متذکرہ اضافی اسباب کو اسی ایک سبب میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ مگر چونکہ عہد عباسیہ میں ایک باضابطہ اور منظم تحریک کی شکل میں غیر اسلامی علوم و افکار کی نشر و اشاعت کی ابتدا ہوئی۔ اس بنا پر اس کو چوتھی جگہ پر رکھا گیا ہے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ذہنی اور ثقافتی تبدیلی کے تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ ڈالی جائے تاکہ عصر حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی موقف کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔

مسلمانوں کی ثقافتی تبدیلی کا تاریخی پس منظر

عصر حاضر کے مسلمانوں کی ذہنی آوارگی اور فکری انتشار کا صحیح موقف متعین کرنے کے لئے ہمیں بہت پیچھے ہٹ کر اس کے تاریخی عوامل کا جائزہ لینا پڑے گا۔

خلفائے راشدین کا دورِ سعادت علمی اور فکری لحاظ سے بالکل سادہ تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کا علمی ماخذ صرف کتاب اللہ اور سنت تھی۔ اور وہ زندگی کے تمام مسائل کے لئے ان ماخذ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ انہوں نے یونانی حکمت و فلسفہ یا دوسرے علوم و فنون کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔ اور ایسا کرنا ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ کیونکہ ان لوگوں نے براہِ راست مشکوٰۃِ نبوت سے استفادہ کیا تھا۔ اور وہ علوم نبوت ہی کے ذریعے فطرت کے راز ہائے درونِ پردہ سے واقف تھے۔

امی بود کہ از اثرِ حکمتِ او — واقفِ سِرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شررِ باختہ رنگے بود است — یک نظر کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم

اور ظاہر ہے کہ ان یقینی علوم الٰہی کے ہوتے ہوئے ان کو یونانی اوہام و خرافات میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

نیز اس دور میں مسلمانوں کے سامنے اقامتِ دین، دعوت و اصلاح اور تاسیسِ مملکت ایسے اہم کام تھے جن کے لئے مسلسل اور لگاتار جہد و عمل اور ذوقِ یقین کی ضرورت تھی۔ اور اس غرض کے لئے ان کو یقینِ محکم اور ولولۂ عمل پیدا کرنے والے علوم ہی کام دے سکتے تھے۔ ایمان و یقین اور قوائے عمل کو مضمحل کرنے والے علوم کی انکو قطعاً ضرورت نہ تھی۔

اموی عہد اقتدار نے اگرچہ مسلمانوں میں بہت سے مفاسد پیدا کئے مگر جہاں تک تہذیب و ثقافت اور آدابِ معاشرت کا تعلق ہے۔ وہ بہت حد تک اغیار کے اثرات سے محفوظ رہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اموی حکمراں خود ہی اپنی مخصوص تہذیب اور کلچر کو عجمی تہذیب سے الگ رکھنا پسند کرتے تھے۔ اور پھر اس دور میں غیر اسلامی علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے لئے کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی جا سکی۔ البتہ اموی عہد کے دورِ متوسط میں سب سے پہلے خالد بن یزید بن معاویہ (جسکو حکیم آلِ مروان کا لقب دیا گیا تھا) نے اُمم سابقہ کی کچھ کتابوں کے تراجم کا اہتمام کیا تھا۔ اس نے یونانی فلسفہ کی ایک جماعت کو اپنے یہاں طلب کیا۔ اور ان کو حکم دیا کہ وہ کتبِ صنعت (کیمیا وغیرہ) کو یونانی اور قبطی زبانوں سے عربی میں منتقل کریں۔ اسکے بعد ہشام بن عبدالملک نے دیوان ’’شام‘‘ کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ مگر اس دور میں جو کچھ ہوا وہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر جب عباسی عہد اقتدار کی ابتدا ہوئی تو غیر اسلامی لٹریچر کو کثرت کے ساتھ عربی زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع ہوا۔ کیونکہ

دولتِ عباسیہ کا قیام ہی دراصل اہل خراسان اور موالی کا مرہونِ احسان تھا۔ اور اسکی وجہ سے عباسیوں اور خراسانیوں کا باہم اختلاط ایک ناگزیر امر تھا۔ چنانچہ اس اختلاط نے آل عباس میں یہ احساس پیدا کیا کہ وہ اہل فارس اور اہل یونان کے علوم و فنون سے واقفیت بہم پہنچائیں۔ سب سے پہلے دولتِ عباسیہ کے دوسرے حکمراں ابوجعفر منصور نے جورجیس بن جبرائیل کو کتب یونان کے ترجمہ پر مامور کیا اور اس نے بہت سی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا۔ اسی طرح حنین بن اسحاق نے بقراط اور جالینوس کی بیشمار طبی کتابوں کا ترجمہ کیا۔

اسکے بعد جب ہارون کا زمانہ آیا تو اس دور میں انقرہ اور عموریہ فتح ہوئے اور کتب یونان کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ جس کے ترجمہ کا خاص اہتمام کیا گیا۔ اسکے بعد مامون جو خود بھی صاحب علم اور بڑا نقاد تھا۔ اس نے اس کام کو پہلے کی نسبت بہت تیز کر دیا۔ بلکہ اس عہد میں مامون کے علاوہ اور بھی بہت سے اہل ثروت نے اس کام کی طرف خاص توجہ دی۔ مثلاً احمد محمد اور حسن جو شاکر المنجم کے بیٹے تھے۔ انہوں نے کچھ علماء فلسفہ کے ذریعہ فلسفہ و ہندسہ، موسیقی اور طب کی عجیب و غریب مصنفات روم سے منگوائیں اور علماء کی ایک جماعت کو ان کے ترجمہ کے کام پر لگا دیا۔ اس جماعت میں حنین بن اسحاق، جیش بن الحسن اور ثابت بن قرہ وغیرہ شامل تھے اور ان مترجمین کے پانچ پانچ سو ماہانہ وظائف مقرر کئے گئے۔ اسی طرح دوسرے بہت سے لوگوں نے اس کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

دوسری اقوام کے علوم و فنون سے واقفیت حاصل کرنا کوئی بُری بات نہیں ہے اور ہر چیز جسکی بنیاد حکمت و دانش پر ہو وہ مرد مومن کا موروثی حق ہے۔ نیز اسلام اتنا تنگ ظرف بھی نہیں ہے کہ وہ علمی حرکت وارتقا سے مانع ہو لیکن اسلام کی نظر میں جو چیز خطرناک ہے۔ وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے اسلامی سرمایۂ فکر کو غیر اسلامی تصورات سے مخلوط کر دیں۔ یا ان کا فکر و ذہن دوسرے علوم و افکار سے متاثر ہو جائے۔ چنانچہ خلفائے عباسی کی اس یونانیت نوازی (جس پر ہمارے مورخین کو بڑا فخر ہے۔ اور وہ اس عہد کو اسلامی تاریخ کا عہد زریں قرار دیتے ہیں) کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں کئی ایسے گروہ پیدا ہوئے جنہوں نے اصول دین اور اسلامی عقائد کو بُری طرح مجروح کیا۔ یعنی یہ لوگ ایک نئے طرزِ فکر کے حامل تھے اور انہوں نے اسی انداز سے دینی اصول و عقائد کا جائزہ لیا اور دینِ خداوندی کو بالکل محرف کر دیا۔ یہ فتنہ پہلے پہل بصرے سے اُٹھا اور اسکے بعد اس نے بغداد کو اپنا مرکز و مستقر بنا لیا۔

بصرہ میں واصل بن عطاء الغزال اور پھر عمر بن عبید عقل پرست گروہ کی نمائندگی کرتے تھے۔ ثانی الذکر سے منصور کو بہت ہی اُنس تھا۔ اور وہ اُن کو تمام علماء معاصرین پر ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی موت پر خود منصور نے مرثیہ کہا تھا۔ اسکے بعد کچھ دوسرے اہل اعتزال اور اصحاب آراء پیدا ہوئے۔ مثلاً ابوالہذیل محمد بن الہذیل العلاف، ابراہیم بن سیار النظام اور بشر بن غیاث المریسی، وغیرہ ان لوگوں نے اصول و عقائد اسلامی میں نئے نئے مباحث کے دروازے کھول دیئے۔

اس دور میں جن مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا وہ ہیں مسئلہ قدر و افعال عباد ۔ مسئلہ صفات باری اور مسئلہ خلق قرآن ! ان مسائل میں اہل اعتزال جمہور المسلمین سے بالکل الگ رائے رکھتے تھے ۔ چنانچہ مسئلہ قدر اور افعال العباد کے بارے میں معتزلہ کی رائے یہ تھی کہ انسان خود ہی افعال کا خالق ہے اور اس بنا پر وہ ثواب و عقاب کا مستحق ہے ۔ اور قضاء و قدر سے مقصود اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق یا خذلان کا حاصل ہونا ہے ۔ صفاتِ الٰہی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالےٰ صفات سے پاک ہے ۔ کیونکہ اسکے لئے اگر صفات تسلیم کی جائیں تو وہ بہر حال قدیم ہونگی اور اس سے تعدد قدماء لازم آئیگا ۔ اسلئے وہ صفات کو عین ذات تصور کرتے تھے ۔ چنانچہ خلقِ قرآن کا عقیدہ بھی اسی مسئلہ کی پیداوار ہے ۔ یعنی وہ جمہور اسلام کے عقیدہ کے برعکس قرآن حکیم کو مخلوق مانتے تھے ۔ اور اسکی وجہ یہ بیان کرتے تھے کہ قرآن جن حروف و اصوات پر مشتمل ہے ۔ خدائے تعالیٰ ان کو ایک جسم حادث میں پیدا کرتا ہے ۔ اور نبی ان کو سنتا ہے ۔ چنانچہ ان کے نزدیک وحی کا مفہوم یہی ہے ۔ اس بنا پر قرآن اللہ کی صفت نہیں بن سکتا ۔

اس خلق قرآن کے مسئلہ میں مامون بھی ان کا ہمنوا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ جن علماء و ائمہ دین نے اس عقیدہ کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا ۔ ان کو اس نے سخت سے سخت سزائیں دیں ۔ در اصل اس مسئلہ میں ان دو گروہوں کا اختلاف محض نزاعِ لفظی معلوم ہوتا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ سالہا سال تک اس مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ۔

اسکے علاوہ اس دور میں خلافت کے مسئلہ پر اہل السنت اور شیعہ میں شدید اختلاف رونما ہوا۔ اور شیعی فرقوں میں سے امامیہ اور زیدیہ بھی اس مسئلہ میں الگ الگ رائے رکھتے تھے۔ اور پھر ان دو فرقوں سے کئی دوسرے فرقے پیدا ہوئے۔

اہل سنت کے علمائے نے اِن جدید فرقوں کے دفاع و مقابلہ کے لئے ایک مستقل فن (علم کلام) کی بنیاد رکھی۔ جس کے ذریعہ انہوں نے عقلی بنیادوں پر ہی اسلامی اصول وعقائد کی تعبیر کی۔ اور آج بھی ہمارے قدیم طرز کے مدارس میں یونانی فلسفہ اور کلام دونوں ہی ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے ہیں۔

دولت عباسیہ میں مامون کا عہد نہضت علمیہ کے اعتبار سے ممتاز خیال کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے زمانہ میں ہر فرقہ کے علمار کو حریت فکر و رائے حاصل تھی۔ اور ان فرقوں میں روز و شب بحث و مذاکرہ اور مناظرہ و مجادلہ کے معرکے جاری رہتے تھے۔ دیکھا دیکھی ہر فرقہ نے اپنے خیالات و معتقدات کے اظہار و بیان کے لئے نیا اسلوب اختیار کیا۔ اور نئی نئی کتابیں تصنیف کیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی توجہ قرآن کی سادہ تعلیم اور موثر طرز استدلال سے ہٹ گئی۔ اور اسکی حکمت بالغہ پر فلسفیانہ طرز استدلال کا غلاف چڑھا یا گیا۔ چنانچہ آج تک ہمارے یہاں جس قدر تفاسیر مروّج ہیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے نعوذ باللہ قرآن حکیم بھی یونانی فلسفہ کی کوئی ادق کتاب ہے۔

بظاہر یہ چیز معمولی سی نظر آتی ہے۔ اور بد قسمتی سے آج تک اسے معمولی ہی سمجھا گیا۔ مگر کچھ دقت نظر سے دیکھا جائے تو یہ وہ خطرناک فتنہ تھا۔ جس نے ملتِ اسلامیہ کے فکر و ذہن کو ایک نئی سمت کی طرف پھیر دیا۔ اور اسکے بعد آج تک قرآن کو خود قرآن اور سنت کی روشنی میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ بلکہ ہمیشہ غیر قرآنی طرزِ فکر سے قرآنی حقائق کو تولا اور ناپا گیا۔ اور اس سے فکر اور عمل کا باہم تعلق جو اسلامی تصورات کا طرۂ امتیاز ہے جاتا رہا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی تصورات کلاسکی علوم و افکار کی طرح کائناتی حقائق سے بے تعلق نہیں ہیں۔ بلکہ وہ سعی و عمل کے واسطہ سے کائناتی مظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یعنی وہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ جس سے انسان کو فطرت کے اسرار و حقائق کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے اندر جذب و تسخیر کی بے پناہ قوت پیدا کر لیتا ہے۔

چوں سرِ رازی را از دیدہ فرو شستم
تقدیرِ امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

اسکے برعکس کلاسکی علوم و تصورات تصوریتِ محضہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ خارجی ماحول میں کوئی تبدیلی پیدا کر سکیں۔ یا ممکناتِ حیات کو درجہ فعلیت عطا کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال افلاطون کے مسلکِ "اعیان نامشہود" کو مسلکِ گوسفندی سے تعبیر کرتا ہے۔

راہب دیرینۂ افلاطون حکیم ۔۔۔ از گروہِ گوسفندانِ قدیم
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت ۔۔۔ خالقِ اعیانِ نامشہود گشت

دیارِ اندلس میں دولتِ امویہ کی "خدمات علمی" کا اگر جائزہ لیا جائے تو وہ بھی افادی حیثیت سے دولت عباسیہ کی خدماتِ علمیہ سے مختلف نہیں ہیں۔ اور ان حکومتوں کے خاتمہ کے بعد اگرچہ اس مخصوص طرز کی حرکتِ علمیہ آگے بڑھنے سے رُک گئی۔ مگر چونکہ اس نے مسلمانوں کے ذہن کو ایک دفعہ اسلامی فکر سے منحرف کر دیا تھا۔ اسلئے آنے والے ادوار میں بھی مسلمان اسی لکیر کو پیٹتے چلے گئے۔ اور بدقسمتی سے آج تک سلسلہ جاری ہے۔

تدوین احادیث تدوین حدیث کا کام بھی اسی دور میں زور وشور سے شروع ہوا۔ چنانچہ امام بخاری۔ امام مسلم، اور دیگر ائمہ حدیث اسی دور میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے فن حدیث میں بڑی بڑی کتابیں تصنیف کیں۔

عہدِ رسالت اور زمانہ خلافتِ راشدہ میں احادیث کی ترتیب وتدوین کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ سب سے پہلے اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں اس کام کی ابتدا ہوئی۔ اور عہد عباسیہ میں اس فن کو عروج حاصل ہوا۔

اس سے پہلے بنی امیہ کے دور میں کئی مذہبی فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ جنہوں نے اپنے معتقدات کی صداقت ثابت کرنے اور دوسروں کو

شکست دینے کے لئے ہزاروں حدیثیں وضع کیں۔ اور ان کو مسلمانوں میں کثرت سے پھیلایا۔ اس طرح ان کذابوں نے نہ صرف اس فن کو بدنام کیا بلکہ ان کے کذب و افترا کی وجہ سے ملتِ اسلامیہ میں سخت ذہنی انتشار پیدا ہوا۔ مگر بعد میں آنے والے علما رحدیث نے انتہائی کاوش سے ان موضوعات کو امکانی حدتک الگ کیا بلکہ اس فن کو زیادہ سے زیادہ مستند بنانے کے لئے انہوں نے روایت حدیث کے لئے نہایت کڑی شرائط وضع کیں۔ اور اس مقصد کے لئے روایت و درایت اور اسماء الرجال کے فن معرض وجود میں آئے۔ یعنی جہاں تک طاقتِ بشریہ کا تعلق ہے۔ انہوں نے فن حدیث کو مستند بنانے میں اپنی پوری قوت صرف کردی۔

یہ صحیح ہے کہ یہ فن افراط و تفریط سے نہیں بچ سکا۔ مگر ہمیں بتایا جائے کہ اور کون سی چیز مسلمانوں کے دست تعدی سے محفوظ رہی ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ پر ان کا بس نہیں چل سکا۔ مگر اسکی معنوی تحریف میں انہوں نے کون سی کسر اٹھا رکھی ہے، محض اس وجہ سے کہ کچھ افترا پردازوں نے اپنی طرف سے حدیثیں وضع کیں، اس فن کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ہی اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ احادیث کی ترتیب وتدوین کا کام بذات خود برا تھا۔ اگر سردار دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم (جن کی ذات گرامی سے ہنگامۂ وجود کی رونق ہے) کے اقوال وارشادات کی طلب وجستجو اور ان کی جمع و ترتیب برا کام ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ دنیا میں نیک کام کونسا ہو سکتا ہے۔ اور پھر وحی الٰہی یعنی قرآن کریم

کے سمجھنے میں اگر زبانِ وحی کا لحاظ نہ کیا جائے تو اور کس چیز کو قرآن فہمی کا ذریعہ بنایا جائے۔ کیا قرآن کریم کو عقل انسانی کا محکوم بنا دیا جائے؟ کہ جس طرح کسی کا جی چاہے قرآن حکیم کی تفسیر کرتا پھرے۔ جیسا کہ بدقسمتی سے حدیث کی موجودگی میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فنِ حدیث کو زوال امت میں دخل نہیں ہے۔ بلکہ زوال امت کا حقیقی سبب یہ ہے کہ قرآن حکیم کو اس سے پہلے سنت کے بجائے حکمتِ یونان کی عینک سے دیکھا جاتا رہا۔ اور آج اسکو دانشِ فرنگ کے سانچے میں ڈھالا جا رہا ہے۔

اہل خانقاہ اور ان کا تصوف

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس دور کے اہل مدرسہ کا حال تھا۔ لیکن اس زمانہ کے اہل خانقاہ نے بھی مسلمانوں کے ذہن و فکر کو بگاڑنے اور ان کے قوائے عمل کو مضمحل کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ چنانچہ دورِ عباسیہ میں یونانی علوم و فنون کی طرح ایرانی تصوف کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور علوم و فلسفہ کی طرح ایرانی تصوف بھی آج تک مسلمانوں کے اعصاب پر مسلّط ہے۔

حق یہ ہے کہ اسلامی تصوف اور فقر کے نام سے آج تک جو کچھ ہوتا رہا ہے اسکے تصور ہی سے سینہ کانپ اُٹھتا ہے۔ اور جگر شق ہونے لگتا ہے بلاشبہ شرک و بدعت اور فسق و معصیت نے تصوف کا لبادہ اوڑھ کر اسلامی عقائد و اعمال اور سیرت و کردار کو بُری طرح پامال کیا اور آجتک

یہی کچھ ہو رہا ہے۔ دنیا کی وہ کونسی بدکرداری ہے جو حلقۂ ارادت میں آ کر عین ثواب نہ بن جاتی ہو۔ اور وہ کونسی قومی خیانت ہے جو فقر کا لباس پہن کر قابلِ فخر کارنامہ نہ بنتی ہو۔

در اصل قوموں میں جب خلوص و دیانت اور احساسِ ملی مفقود ہو جاتا ہے تو وہ ہر مقدس چیز کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لئے آلۂ کار بنا لیتی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں نے فقر سے یہی سلوک کیا، ورنہ جہاں تک قرآنی فقر کا تعلق ہے۔ وہ ایک بلند تر اور مقدس تر اخلاقی طاقت ہے جو دنیا کے فراعنہ و نماردہ کو اپنے آگے سرنگوں کر دیتی ہے۔ اور اس کی ایک ہی جنبشِ نظر عالم ہست و بود میں تہلکہ برپا کر دیتی ہے ؎

فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر | از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیِ بدر و حنین | فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین

مگر بدقسمتی سے مسلمانوں نے فقر کو مستی و طرب اور نغمہ و سرود کا ہم معنی تصور کر لیا۔

فقرِ قرآں احتسابِ ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقرِ مومن چیست تسخیرِ جہات | بندہ از تاثیرِ او مولیٰ صفات

اسباب فساد کے اعتبار سے امم اسلامیہ حاضرہ کا موقف

اسباب زوالِ امت کی بحث سے مقصود بالذات دورِ حاضر کے مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی مفاسد اور انکے حقیقی اسباب فساد کی ٹوہ لگانا ہے کیونکہ ملت کی تعمیر جدید موجودہ اسباب فساد کی تشخیص اور انکی اصلاح و ازالہ ہی سے ممکن ہے۔ لیکن چونکہ عصر زوال کے اسباب فساد دور ماضی کے اسباب فساد ہی کے ارتقائی مراحل ہیں۔ اور زمانہ حال کے اسباب فساد کے اظہار و بیان میں دور ماضی کے اسباب فساد سے اغماض نہیں کیا جا سکتا اسلئے تاریخ ماضی کے اسباب زوال و فساد پر اجمالی اور سرسری تبصرہ کیا گیا ہے۔

در اصل امت کا زوال (جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس دن سے شروع ہوا ہے۔ جبکہ مسلمانوں کے بنیادی تصور حیات میں تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اور نسلی و طبقاتی احساس و شعور نے ان کے ہمہ گیر احساس ملی پر تسلط جمایا۔ لیکن قوموں کا زوال کچھ اس طرح غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اسکی تکمیل میں صدیاں گذر جاتی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کا زوال پذیر سیاسی اقتدار ایک ہزار سال سے زائد عرصہ تک اقوام دنیا سے اپنی قوت و شوکت کا سکہ منواتا چلا آیا اور بالآخر اٹھارہویں صدی

میں اس دیرینہ مریض نے تڑپ تڑپ کر جان دیدی - اور اپنے پیچھے وہ نقوش و آثار چھوڑ گیا - جو تا ابد مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی یاد تازہ کرتے رہیں گے - ؎

اگرچہ میکدہ سے اُٹھ کے چل دیا ساقی
وہ مے وہ خم وہ صراحی وہ جام باقی ہے

اس رُو بہ تنزل اقتدار کے دور میں مسلمانوں نے اگرچہ اپنی ملی سیرت کا بہت بڑا حصہ ضائع کر دیا - اور اسکی جگہ غیر مسلم اقوام کے قومی خصائص کو اپنے اندر جذب کیا - لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے دوسروں سے جتنا کچھ اثر لیا اس سے کم یا زیادہ دوسرے لوگوں نے بھی ان کا اثر قبول کیا اسلئے کہ یہ صاحب اقتدار تھے - اور دوسری قوموں کو طوعاً و کرہاً ان کا رنگ اختیار کرنا پڑتا تھا - مگر جب اقتدار دوسری قوموں کی طرف چلا گیا تو اب مسلمانوں کی حالت اس بے کس اور مفلوک الحال شخص کی سی ہوگئی جو اپنے عسر و افلاس کی وجہ سے ہر خوشحال شخص کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے - لیکن دوسرے لوگ اسکو دیکھ کر کترا جاتے ہیں - وہ دوسروں جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن دوسرے اسکی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے - یہ مسلمانوں کی محکومیت اور عسر و غلامی کا دور ہے - اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس دور میں ان کے فکر و ذہن کے پنپنے کی تمام راہیں بند ہوگئیں - اور ان میں اپنی ملی سیرت کا کچھ حصہ باقی تھا تو وہ غلامی کی نذر ہو گیا - جو مفاسد ان میں پہلے سے چلے آتے تھے - وہ دس گنا اور بڑھ گئے

یا ان مفاسد نے دانشِ حاضر کے زیر اثر بالکل نئی وضع اختیار کر لی۔
مسلمانوں کا دورِ ملوکیت اپنے پیچھے جو مفاسد چھوڑ گیا تھا وہ قریب قریب وہی ہیں جن کا ذکر گذشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ نظامِ شاہی اگرچہ اقتدار کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ لیکن اسکے پیدا کردہ تمام مفاسد جسمِ ملت کے رگ وپے میں راسخ ہو چکے تھے۔ اور دورِ غلامی نے ان کو اور زیادہ گہرا کر دیا۔ بلکہ تہذیب حاضر کے غلبہ و استیلا نے مسلمانوں کی دوازدہ صد سالہ کمزور اور مضمحل تہذیب کو بالکل ایک نئی سمت کی جانب پھیر دیا۔

مغربی تہذیب کا ذہنی پس منظر

اسلامی تہذیب اور تہذیب مغرب میں کامل تضاد ہے۔ اسلامی تہذیب میں اخلاقی اور مابعد الطبعی تصورات کو اساسی درجہ حاصل ہے۔ اور مغربی تہذیب کو دہریت والحاد اور مادیت وتشکک نے پیدا کیا ہے۔ اسلئے یہ اخلاق، خدا پرستی اور دین ومذہب کی گرفت سے آزاد ہے۔ اور مادہ پرستی ہی اس کا دین وایمان ہے۔
آج سے چار پانچ سو سال قبل کلیسائی رہبانیت کی سکون پرستی نے مسیحی اقوام کے قوائے عمل کو مضمحل کر رکھا تھا۔ اور اس دور میں جس کو دورِ نشاۃ جدید کا نام دیا گیا ہے۔ ان اقوام ہی سے کچھ ایسے لوگ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے یہ محسوس کیا کہ ہمارے زوال و انحطاط کا تنہا سبب ہمارے سراپا غلط مذہبی تصورات ہیں۔ جن سے ہماری اجتماعی ترقی کی تمام

راہیں مسدود ہوگئی ہیں۔ انہوں نے ابتدا میں کلیسا نواز جماعتوں کے جامد وساکن تصورِ زندگی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اور آگے چل کر اس جدید تحریک نے مطلق مذہب کو اپنا حریف بنا لیا۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ابتدا میں ہر انقلابی تصور کچھ بندھا سمٹا اور محدود ہوتا ہے۔ اور بڑی حد تک پرانے ماحول کی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اسکو کچھ کچھ قدیم تصورات کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ لیکن جس قدر قدیم ماحول کی بندشیں ڈھیلی ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اسی تناسب سے اس انقلابی تصور کا پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے۔ اور اگر یہ انقلابی تصور کسی معتدل اور متوازن فلسفۂ زندگی پر مبنی نہ ہو تو آگے چل کر اسکا سیلاب قدیم معاشرہ کی برائیوں کے ساتھ ساتھ اسکی اچھائیوں کو بھی بہالے جاتا ہے۔ اور اس غیر متوازن انقلابی تصور کی اساس پر جس نئی تہذیب کی عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ اس میں بے ترتیبی، بدنظمی، بے اعتدالی اور ہولناک تباہی کے محرکات روز اول ہی سے موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس دور کے انقلاب پسندوں کی جدید تحریک بھی ابتدا میں عیسائیت کے تصورِ رہبانیت (جو اصل میں دینی تصور نہ تھا) کے خلاف اُٹھی تھی۔ مگر آگے چل کر اس نے بجائے اصلاح وتعمیر کے تخریبی اور انقلابی شکل اختیار کر لی۔ اور سرے سے دین ومذہب کی عمارت ہی کو ڈھادینے اور اسکے کھنڈروں پر لادینی والحاد کا محل تعمیر کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ یہی وہ تخریبی تصور تھا جس پر تہذیب جدید کی بنیادیں اُٹھائی گئیں۔

بلا شبہ جو مذہب انسانوں کی عملی زندگی کے جدید تقاضوں سے تعرض نہ کرتا ہو۔ اور ممکناتِ حیات کو اجاگر کرنے میں قوائے انسانی کی مدد کرنے سے قاصر ہو۔ ایسے مذہب کی انسانوں کو ضرورت نہیں ہے۔ ایسا مذہب ممکن ہے کہ مُردوں کو کوئی فائدہ دے سکے۔ لیکن زندہ انسانوں کو ایسے دین کی ضرورت ہے۔ جو ان کی عملی زندگی میں ان کا ساتھ دے سکتا ہو اور ہر قدم پر انکی رہنمائی کر سکتا ہو۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انسانوں کو فطرت کی پہنائیوں سے آگاہ کرتا اور ان کو جذب و تسخیر کی بے پایاں قوت عطا کرتا ہوں۔ جس مذہب میں یہ شانِ توانائی نہ ہو، وہ زندہ انسانوں کا مذہب بننے کی ہرگز صلاحیت نہیں رکھتا۔

وائے آں دینے کہ خواب آرد ترا باز در خوابِ گراں بارد ترا
سحر و افسون ست یا دین ست ایں حب افیون ست یا دین ست ایں (اقبال)

مگر ان رجالِ انقلاب کے سامنے چونکہ اسوقت کی عیسائیت کا مسخ شدہ اڈیشن تھا۔ جسکے تصورِ رہبانیت نے قوم کے قوائے فکر و عمل کو معطل کر دیا تھا اسلئے اسکے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا ہونی ناگزیر تھی۔ لیکن اس نفرت نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ عیسائیت کے اُن مقدس اخلاقی تصورات کو بھی ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا۔ جن میں احترامِ آدمیت اور دیگر اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے۔ اور پھر صرف عیسوی مذہب ہی پر اکتفا نہیں کی گئی بلکہ ہر مذہب اور مذہب کی ہر چیز کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ تصور کر لیا گیا۔ یہ ایک نہایت خطرناک لغزش تھی جس نے ترقی پسندوں کو اُن ہمہ گیر اصولِ

انسانیت سے محروم کر دیا جو انسانوں کو زندگی کا ایک معصوم اور بلند تر مقصد عطا کرتے۔ اور ان کی حیات اجتماعیہ کو ایک مخصوص آئینی نظم کے تحت آگے کی طرف لے جاتے ہیں۔ اگر انسانی جدوجہد کو اخلاقی قیود و اقدار کی رعایت سے دور رکھا جائے تو لازمی طور پر زندگی میں بے پناہ خلجان، خطرناک بدنظمی و بے ہنگامی اور تباہ کن انتشار رونما ہوتا ہے۔ جو انسانی جماعات کو دائمی سوزش و اضطراب کے جہنم میں ڈھکیل دیتا ہے۔

حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں مغرب نے جتنے بڑے بڑے مفکر پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر حضرات نے صرف مادی نقطۂ نظر سے حیاتِ انسانی کا جائزہ لیا۔ فلسفۂ مادیت اور اسکے نظام تہذیب و تمدن کو سائنٹیفک اور اخلاق و مذہب کو اَن سائنٹیفک قرار دیا۔ چنانچہ سترہویں صدی کے نصف اول میں ڈیکارٹ نے فلسفۂ مادیت کی بنیاد رکھی۔ اور اسی صدی کے نصف آخر میں مغرب کے مشہور فلسفی ہابس نے نظام کائنات کی میکانکی طریق سے توجیہ کی۔ اور مابعد الطبیعی تصورات کا انکار کیا۔ اس صدی میں اور بہت سے اہل فکر پیدا ہوئے جو محض مادی نقطۂ نظر سے عقدۂ زندگی کو حل کرنا چاہتے تھے۔ اسی طرح اٹھارہویں صدی میں جوزف برکلے، والٹیر، روسو، اور دیگر کئی حکما پیدا ہوئے جنہوں نے فلسفۂ مادیت کو پہلے سے زیادہ وسعت دی۔ اور ان میں سے اکثر نے خدا کے وجود کا انکار کیا۔ انیسویں صدی میں اسپنسر نے علانیہ خدا کا انکار کیا اور کائنات کے خود بخود پیدا ہونے۔ اور

خود بخود ارتقائی مراحل طے کرنے کا نظریہ بلند آہنگی سے پیش کیا۔ اور ڈارون کے نظریۂ ارتقا نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

مگر آج عمل کی تجربہ گاہ میں یہ سائنٹیفک نظریات نہ صرف ناکارہ بلکہ شر و فساد اور عالمگیر شورش و بدامنی کے محرک ثابت ہو چکے ہیں۔ چنانچہ آج اقوام مغرب کے سنجیدہ فکر اور حساس لوگوں نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ موجودہ ہمہ گیر شورش و اضطراب اور انسانیت کی زہرہ گداز بربادی کا سبب یہی ہے کہ تہذیبِ حاضر کو اُن معصوم اور مقدس اصول انسانیت سے الگ رکھا گیا ہے۔ جو انسانوں میں خیر و شر کی تمیز اور احترام انسانیت کا جذبہ پیدا کرنے والے ہیں ؎

عصرِ تو از رمزِ جاں آگاہ نیست
دین او جز حبِ غیر اللہ نیست

کاش کہ ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ مذہب انسانیت کا بہترین محافظ اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت کا علمبردار ہے۔ اور اگر عیسائیت ان کی عملی زندگی کی جدید ضرورتوں کو پورا نہ کر سکتی تھی تو ان کے لئے صحیح راہ عمل یہ تھی کہ وہ انسانیت کے مفاد عامہ کی خاطر اسلامی فلسفۂ حیات کی طرف رجوع کرتے۔ اگر ان کو اس کی توفیق نصیب ہوتی تو بلاشبہ وہ عقدۂ زندگی کو حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ کیونکہ قرآنی فلسفۂ زندگی حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں پر یکساں نظر رکھتا ہے۔ وہ صرف روح کی تپش کی تسکین ہی نہیں کرتا بلکہ مادہ و جسم کے تمام مطالبات سے عہدہ برآ ہونے

کی کامل صلاحیت رکھتا ہے۔ اور زندگی کے ذہنی اور خارجی اجزا میں حیرت انگیز اعتدال و توازن پیدا کرتا ہے۔ نیز کائنات عالم میں یہی وہ جامع اور ہمہ گیر فلسفۂ زندگی ہے جو اقوام عالم میں ایک وسیع تر رشتہ اخوت پیدا کر سکتا ہے اور یقیناً اسی کے ذریعہ دنیا کو امن و سکون کی دولت میسر آ سکتی ہے۔

ممالک اسلامیہ میں تہذیب جدیدہ کا اثر و نفوذ

گذشتہ مباحث میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف اسلامی تہذیب تھی جو صدیوں سے مائل بہ انحطاط تھی۔ اور بیرونی اثرات سے اسدرجہ متاثر ہو چکی تھی کہ اس میں کسی نئی طاقتور تہذیب کا مقابلہ کرنے کی تاب ہی نہ تھی۔ اور دوسری طرف مغربی تہذیب تھی جو اپنی زہر آلود اور انسانیت کش فطرت کے باوصف تمام جدید آلات اور علمی انکشافات سے مسلح تھی۔ بالآخر اٹھارہویں صدی کے نصف اوّل میں اسلامی تہذیب ضعف و انحطاط کے آخری نقطہ پر پہنچ چکی تھی اور مغربی تہذیب اپنے دورِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی چنانچہ ان کے باہم تصادم سے اسلامی تہذیب کا وہی حشر ہوا جو کسی قوی تر چیز کے مقابلہ میں کمزور تر چیز کا ہو سکتا ہے۔

"چونکہ قوم کی تہذیب و تمدن کا انحطاط دراصل اسکے قوائے فکر و عمل کا انحطاط ہے۔ اور جو قوم فکر و عمل کے لحاظ سے انحطاط پذیر ہو وہ اپنی حریت و آزادی اور مقام شرف کو محفوظ رکھنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی یہی وجہ تھی کہ اٹھارہویں صدی میں مغربی اقوام کی یلغار سے قریباً تمام

عالم اسلامی کو تہ و بالا کر دیا۔ اور سوائے ایک دو اسلامی ممالک کے کوئی
اسلامی ملک ان کی زد سے نہ بچ سکا۔ بلکہ جہاں تک اقوام غالبہ کی تہذیب
و ثقافت کے اثر و نفوذ کا تعلق ہے اس سے کوئی اسلامی ملک محفوظ نہ رہ سکا
یعنی مغربی اقوام نے غلبہ و اقتدار حاصل کرنے کے بعد اپنی مخصوص حکمت عملی
سے مسلمانانِ عالم کے ذہن و فکر اور دین و مذہب میں بھی تصرف کیا جو ممالک
عملاً محکوم ہو گئے تھے۔ انہوں تو بہر حال اقوام غالبہ سے اثر لینا تھا
لیکن جن اسلامی ممالک نے ایک حد تک اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ وہ بھی
ذہنی مرعوبیت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ ذہنی غلامی میں آزاد
اسلامی ممالک محکوم ممالک سے بھی سبقت لے گئے۔ اور اگر دیکھا جائے تو
اقوام مغرب کی وسیع اور طاقتور سلطنتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی
ایک دو محدود اور غیر ترقی یافتہ حکومتوں کی حقیقت ہی کیا تھی۔ محکوم
ممالک کے مسلمانوں کی طرح ان میں بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ اہل مغرب
کے عروج و ارتقاء کا اصل منبع ان کی سائنٹیفک تہذیب ہی ہے۔ اور اب
ہمارے لئے عروج و ترقی کا بجز اسکے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کہ ہم ان کا
کامل اتباع کریں اور جس شاہراہ پر چل کر انہوں نے قوت و اقتدار اور
عزت و جاہ کا بلند مقام حاصل کیا ہے۔ ہم بھی اسی راہ پر چل کر ترقی
کی منزلیں طے کریں۔

اسکے علاوہ جو اسلامی ممالک مسیحی اقوام کی غلامی میں چلے گئے تھے ان
میں تو یہ حکمران قومیں سیاہ و سپید کی مالک تھیں۔ اور محکوم مسلمانوں کی

قسمت کی باگ ڈور ان کے قبضۂ اقتدار میں تھی۔ اسلئے ان مسلمانوں کے قبلہ و کعبہ کا رُخ بدلنے میں ان کے لئے کچھ دقت نہ تھی۔ لیکن مسلمانوں کے آزاد اور خود مختار ممالک کی ملکی سیاست بھی ان اقوام کی ریشہ دوانیوں سے متاثر رہی ہے۔ اور جو ملک سیاسی اعتبار سے اس قدر کمزور ہو کہ وہ بیرونی سیاسی قوتوں کے اثر و نفوذ کی مقاومت نہ کر سکتا ہو وہ اپنی تہذیب و ثقافت کو بھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

حاصل یہ ہے کہ جو اقوام اعلیٰ سیاسی اقتدار کی مالک ہوتی ہیں وہ محکوم اور کمزور اقوام کے ذہن و فکر پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی ممالک (اگرچہ ان میں سے اکثر اب آزاد ہو چکے ہیں) ایک سے ایک بڑھ کر ذہنی مرعوبیت میں مبتلا ہیں۔ مگر ان کے مختلف طبقات میں اس ذہنی مرعوبیت و کمتری کے مظاہر الگ الگ ہیں۔ ان کا ایک طبقہ وہ ہے جو غیر ملکی اقتدار کی گود میں پلا ہے۔ اور وہ اپنے ظاہر و باطن میں بالکل اپنے آقاؤں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ چنانچہ تمام عالم اسلامی اور بالخصوص پاکستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اپنے سفید آقاؤں کے نقشِ قدم پر چلنے کو اپنا قابل فخر امتیاز تصور کرتے ہیں۔ ان کا ذہن کچھ اس طرح مسخ ہو چکا ہے کہ اس میں احساسِ ذات کا کوئی شائبہ تک باقی نہیں رہا۔ شاہدِ فرنگ کی ہر ادا پر جان دیدینا ہی ان کا شعار ہے اور ان کے پاس جس قدر علمی اور ذہنی سرمایہ ہے وہ خدایانِ فرنگ ہی سے انہوں نے مستعار لیا ہے۔

عقل تو زنجیری افکار غیر　　در گلوئے تو نفس از تار غیر
بر زبانت گفتگوہا مستعار　　در دلِ تو آرزوہا مستعار
آفتاب، ہستی یکے در خود نگر　　از نجوم دیگراں تابے مخر
تا کجا طوفِ چراغِ محفلے　　ز آتش خود سوز اگر داری دلے

ایک دوسرا گروہ ہے جس کو موجودہ نظام سرمایہ داری کی نفرت نے کارل مارکس اور لینین کے قدموں پر جھکا دیا ہے۔ اور وہ اشتراکی فلسفۂ زندگی پر ایمان رکھتا ہے۔ دراصل یہ گروہ بھی پہلے گروہ کی طرح دریوزہ گر ہے۔ اور اس میں بھی شرف النفس اور احساس ذات کا فقدان ہے۔ آخر کافرانہ طرز زندگی اور غیر اسلامی تصورات سے عقیدت کا اسکے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ ان لوگوں کا ذہن اسلامی تصورات کی عقیدت و احترام سے بالکل خالی ہے۔ اور وہ اپنی ملی روایات سے ناآشنا ہیں۔ ؎

از سوال آشفتہ اجزاء خودی　　بے تجلی نخل سینائے خودی
وائے بر منت پذیر خوانِ غیر　　گردنش خم گشتۂ احسانِ غیر

ایک تیسرا گروہ ہے جو مذکورہ دو گروہوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ گروہ اپنے ساتھ مذہب اور قرآن کو بھی مغربی مکاتب فکر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اور اسکے بیشتر وہ لوگ ہیں جو مغربی علوم و فنون کی کچھ سوجھ بوجھ رکھنے کے علاوہ عربی زبان سے بھی قدرے واقف ہیں

مگر یہ لوگ براہ راست قرآن کریم سے استفادہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے بلکہ استاذانِ یورپ کی عینک چڑھا کر قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہیں، اور جب یہ قرآن کی حکمتِ بالغہ سے بحث کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن حکیم جدید مغربی حکماء و فلاسفہ کی ترجمانی کے لئے اُترا ہے قرآنی آیات کو انسانی نظریات پر منطبق کرنے کے لئے پوری قوت صرف کر دیتے ہیں۔ خواہ اس میں آیات قرآنی کے اصلی منشا اور سیاق و سباق کا خون ہی کرنا پڑے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ حکومت کی کلرکی اختیار کرنے کے لئے بھی کسی علمی سند اور سارٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر علوم قرآنی کی تفسیر و تعبیر کے لئے آج کسی علمی قابلیت کی ضرورت نہیں ہے جس کا جی چاہے وہ بے دریغ قرآن کریم کو مشق ستم بنانا شروع کر دیتا ہے اور انتہائی دیدہ دلیری سے قرآنی آیات کو مسخ کرنے لگتا ہے۔

ان لوگوں کی علمی بصیرت پر ماتم کرنا چاہیئے کہ جب انکے مغربی ائمہ ضلال کی طرف سے کوئی نیا اکتشاف سامنے آتا ہے تو یہ قرآن میں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس میں کہیں ایسی آیت مل جائے جسکو اس جدید نظریہ پر منطبق کیا جا سکے۔ اور جب اس میں کسی طرح کامیاب ہو جاتے ہیں، تو مارے خوشی کے اچھلنے لگتے ہیں اور غریب مولویوں کو بے نقط سنانا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ان نئے مفسروں سے کوئی پوچھتا نہیں کہ خدا کے بندو! تم اس جدید اکتشافات سے پہلے کہاں تھے؟ آخر یہی قرآن اس سے پہلے بھی تمہارے پاس تھا۔ اگر تم اتنے صاحبِ بصیرت تھے تو اس

پہلے تم نے قرآن حکیم سے کسی جدید نظریہ کا انکشاف کیا ہوتا۔ اور پھر ایجاد و اختراع کے میدان میں اگر غریب مولوی کچھ نہیں کر سکا تو تم نے کون سے ہوائی جہاز اور ایٹم بم تیار کر لئے ہیں۔ قرآن حکیم کو مسخ کر کے اسکو حکمتِ مغرب کے سانچے میں ڈھالنا کونسی مشکل بات ہے۔ جس پر تم فخر کرتے ہو بلکہ یہ تو انتہائی درجہ کی ذہنی گراوٹ ہے۔ ان لوگوں سے بس اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ خدارا قرآن حکیم کو مذاق نہ بناؤ۔ تم خود جس طرف جانا چاہتے ہو بلیشک جاؤ لیکن قرآن حکیم کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر نہ لے جاؤ۔

عصرِ حاضر کا سب سے بڑا فتنہ

تہذیب مغرب نے امم اسلامیہ کو جو گراں بہا تحفے دیئے ہیں۔ ان میں ایک بڑا تحفہ وطنی قومیت (نیشنلزم) کا تصور ہے۔ جس نے عالمگیر اخوتِ اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا۔ اور آج ہر ملک کے مسلمان اپنے آپ کو دوسرے ممالک کے مسلمانوں سے الگ قوم تصور کرتے ہیں۔

قرنِ اول سے ایک ہزار سال تک مسلمانانِ عالم میں بیشمار اجتماعی اور ملی مفاسد پیدا ہوئے۔ ان میں خاندانی رقابت بھی تھی۔ اور سیاسی اور مذہبی جنگیں بھی ہوتی رہیں۔ مگر اتنی بات تھی کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک گہرے اعتقادی رشتہ میں منسلک تھے۔ اور جغرافی یا وطنی حدود ان کے اس مقدس رشتہ کی راہ میں حائل نہ تھیں۔ تمام عالم اسلامی ایک مرکز خلافت کو تسلیم کرتا تھا۔ جسکی وجہ سے انکی وحدت ملی مستحکم تھی چنانچہ آج سے کچھ عرصہ پہلے سلطنتِ عثمانیہ کو مسلمانانِ عالم میں مرکزی مقام

حاصل تھا۔ لیکن مغربی اقوام کے استعمار پسندانہ عزائم کی راہ میں مسلمانوں کا یہ وسیع تر رشتہ اخوت رکاوٹ بن سکتا تھا۔ اسلئے ان اقوام نے تمام ممالک اسلامیہ میں وطنی عصبیت کو ابھارنے کی ناپاک مہم شروع کی۔ اور اس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ مسلمان جو اس سے پہلے قوم واحد تھے کئی وطنی قومیتوں میں بٹ گئے۔ اور اسکے نتائج وہ ابتک بھگت رہے ہیں۔ مگر حیرانی کی بات ہے کہ ان تلخ نتائج کے باوجود آج تک وہ اسی خطرناک راستہ پر گامزن ہیں۔ چنانچہ امم اسلامیہ کی آج بھی یہ حالت ہے کہ ترکی اپنے مخصوص ملکی مفاد کی خاطر امم عربیہ کے مفاد سے پہلوتہی کرجاتا ہے۔ اور عرب لیگ اپنی مصلحتوں کے پیش نظر ہندوستان ایسے مسلم کش ملک کی حمایت کرتی ہے۔ افسوس ہے کہ ابتک ان کو اس بات کا احساس نہیں ہو سکا کہ کسی ایک ملک کے محض اقتصادی یا کسی دوسرے جزوی مفاد کی نسبت اجتماعی اور ملی مفاد کی رعایت عالم اسلامی کو دنیا کی عظیم ترین طاقت بنا سکتی ہے۔ اور یہ اجتماعی اور ملی طاقت ہر اسلامی ملک کی حفاظت و صیانت اور اسکے اقتصادی استحکام کی ضامن ہو سکتی ہے۔ بہرحال تہذیب حاضر نے ملت اسلامیہ کو جو کچھ دیا ہے اس کا حال عصر حاضر کے اسلامی مفکر اقبال کی زبان سے سنئیے۔

اے تہی از ذوق و شوق و سوز و درد   می شناسی عصر ما را ما چہ کرد
عصر ما را ز ما بیگانہ ساخت   از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ ساخت

مباحثِ ماضیہ پر نظرِ ثانی

جب ہم اُمت کے مستقبل کی تعمیرِ جدید کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا ذہن متعدد اُمور کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ پہلے یہ کہ تعمیری لائحہ عمل کی ترتیب و تدوین سے قبل ہم اپنے ماحول پر جچی تلی، اور نہایت گہری نگاہ ڈالیں۔ اور اسکے تمام مفاسد کو چُن چُن کر سامنے لائیں۔ دوسرے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہمارے موجودہ ماحول کو ادوارِ ماضیہ سے کیا نسبت ہے۔ اس سلسلہ میں ماضی کے اسبابِ زوالِ اُمت پر عمیق اور تنقیدی نگاہ ڈالنا، اور پھر فسادِ امت کے نقطۂ ابتدا اور نقطۂ انتہا، اور مختلف تاریخی ادوار کے تخریبی عوامل کو زیرِ بحث لانا ضروری ہے۔ نیز ان تاریخی ادوار میں اصلاح و تعمیر اور احیاء و تجدیدِ دین کی جس قدر انفرادی یا اجتماعی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ ان کا اجمالی تعارف بھی بہرحال ناگزیر ہے۔ تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ ماضی کی کامیاب اور ناکام کوششوں کی کامیابی اور ناکامی کے اسباب و وجوہ کیا ہیں؟ اور آئندہ کی تعمیری جدوجہد میں ہم ان تجربات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ مسائل غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، اور بغرضِ افادہ ہم آگے

بڑھنے سے پہلے مباحثِ ماضیہ پر دوبارہ ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسبابِ زوالِ امت کی تشخیص کے معاملہ میں ہمارے مؤرخین نے کچھ ایسا اُلجھاؤ پیدا کر دیا ہے کہ بہت ہی گہری نظر کے سوا اس کا سمجھنا سخت دشوار ہے۔ ہر مؤرخ نے اپنی افتادِ طبیعت کے مطابق اممِ اسلامیہ کے اسباب عروج و زوال سے بحث کی ہے۔ اور ان کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں پر مشتمل ہے جنکی نظر نہایت محدود اور سطحی ہے۔ انہوں نے دولِ اسلامیہ کے عروج و زوال سے جہاں بحث کی ہے۔ کہیں معاشرتی مفاسد و معائب، کہیں معاشی نقائص، اور کہیں علم و فضل کے فقدان تک ہی ان کی نگاہ پہنچ سکی ہے۔ ان کی تحریروں سے ہم یہ بات سمجھنے میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتے کہ ان تمام خارجی اور اضافی اسباب کا پس منظر یا علۃ العلل کیا ہے جو ان خارجی اسباب کی تخلیق کرتی ہے۔ اگر آج ہم اس حیثیت سے اسباب زوال امت پر غور کریں تو فسادِ اُمت کے ابتدائی دور سے زمانہ حاضر تک کے تمام مفاسد میں عقلی اور منطقی طور پر ربط معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہم اپنے ماحول کے مفاسد کو بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

عام انسانی اور بین الملی نقطۂ نظر سے ہم اقوامِ دنیا کے اسباب عروج و زوال کا جائزہ لینا چاہیں تو کم از کم اتنی بات تمام اقوام و ملل میں قدرِ مشترک کا درجہ رکھتی ہے کہ ہر قوم و ملت اپنے افراد کی ذہنی اور فکری ہم آہنگی یا اجتماعی اور ملی شعور سے اپنی ارتقائی حرکت کا آغاز

کرتی ہے۔ اور جس قدر اس میں غایت اجتماعیہ اور مقصد ملی کی لگن تیز ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی تناسب سے اسکے اعمال میں وحدت ویگانگت کا رنگ نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور فکر و عمل کی یک جہتی سے اسکی سیاست و معیشت اور دیگر مسائل حیات خود بخود سلجھتے چلے جاتے ہیں۔ یہ غایت اجتماعیہ یا مصلحت کلیہ قوم کے افراد میں ایک گہرا اور پائیدار تعلق پیدا کرتی ہے اور جبتک اس مصلحت کلیہ کا احساس موجود رہتا ہے وہ اسکی خاطر اپنی ذاتی قبیلوی، نسلی، اور خاندانی مصلحتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مگر اس غایت اجتماعیہ کی محبت جب کمزور ہو جاتی ہے۔ تو اغراض جزئیہ ابھر سامنے آجاتی ہیں۔ اور اس سے قوموں کا زوال شروع ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ دنیا کی دوسری اقوام اور ملت اسلامیہ کے تصورات زندگی میں زمین و آسمان کا فرق ہے مگر جہاں تک عروج و زوال کے اس عام انسانی تصور کا تعلق ہے۔ مسلمان قوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یعنی اس کے عروج و زوال میں بھی یہی حقیقت عامہ کارفرما ہے۔ اور اگر ہم اسی نقطۂ نظر سے تاریخ اسلامی کے مختلف ادوار کا جائزہ لینا چاہیں تو ان میں یہ بنیادی حقیقت روح کی طرح جاری وساری نظر آتی ہے جو ان ادوار کے تخریبی عوامل میں ایک طرح کا ربط پیدا کرتی ہے۔

مثلاً سب سے پہلے زمانہ رسالت کو لیجئے۔ اس میں مقصدی شعور اور غایتِ اجتماعیہ کی افادیت کا اذعان و یقین جسکو قرآنی اصطلاح میں "ایمان" کہا گیا ہے، اتنا بلند، اتنا مستحکم اور اتنا اکمل تھا کہ غایاتِ جزئیہ کو اسکے سامنے دم مارنے کی جرأت نہ تھی۔ وہ زندگی کے ہر مسئلہ کو اس

اجتماعی اور مقصدی نقطۂ نظر سے حل کرنا جانتے تھے۔ اُن کے سامنے زندگی کا ایک پاکیزہ اور بلند تر تصور تھا۔ اور ان کا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا چلنا پھرنا اسی مقصد کے تابع تھا۔ چنانچہ اس ذہنی اور فکری وحدت نے انکے اعمال میں حیرت انگیز یگانگت پیدا کر دی تھی۔ نظم و اتحاد تھا تو اسکی بدولت۔ جذبۂ اطاعت تھا تو اسکی وجہ سے، ولولۂ ایثار و قربانی اور حیران کن شجاعت و بسالت تھی تو محض اسی یقین کی برکت سے!

خلافت راشدہ کا عہد مجموعی طور پر بلاشبہ علیٰ منہاج النبوۃ تھا کیونکہ سیاسی اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں تھا جو فکر و عمل کے لحاظ سے کامل مسلمان تھے۔ اور ان کی موجودگی میں مصالح جزئیہ اور نسلی عصبیت کو اُبھرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ مگر کچھ طبقوں میں اندر ہی اندر نسلی رقابت کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں جو شہادت عثمانؓ کے بعد پوری قوت سے بھڑک اُٹھیں۔ یہ نسلی شعور یا مصلحت جزئیہ دراصل اُس مقصدی شعور کی ضد ہے جو عہد رسالت کے مسلمانوں میں بدرجہ اتم موجود تھا اور اسی سے زوالِ امت کی ابتدا ہوئی ہے۔

نسلی عصبیت کا ظہور چونکہ ملی نصب العین کی عقیدت کے ضعف و انتشار کا نتیجہ تھا۔ اسلئے اسکے ساتھ اور بہت سی ذاتی اغراض اور مصالح جزئیہ کا ہجوم ناگزیر تھا۔ چنانچہ اموی دور کے نظام آمریت و ملوکیت کا قیام و تسلط بھی اسکی وجہ سے ہوا۔ اور پھر آگے چل کر وہ تمام مفاسد

پیدا ہوتے چلے گئے۔ جو ملوکیت کے متعلقات و لوازمات تھے۔ مثلاً ظلم و تشدد، نظامِ جاگیرداری، معاشی نامساوات، سیاسی اور مذہبی دھڑے بندیاں، امرأ و سلاطین کی معاشرتی بے اعتدالیاں اور شاہی خاندان کے ارکان میں خودغرضانہ تصادم یہی وہ مفاسد تھے جو بالآخر دولت اموی کی تباہی پر منتج ہوئے۔

دولتِ عباسیہ بھی عصبیتِ جاہلیہ کے ساتھ ظہور میں آئی۔ بلکہ انکی عصبیت، امویوں کی عصبیت سے شدید تر اور خطرناک تھی یعنی امویوں نے محض اپنی طاقت سے ایک سو سال تک حکومت کی۔ اور انہوں نے فاطمیوں یا عباسیوں کے خلاف باہر سے کسی کی مدد نہیں لی۔ مگر عباسیوں نے امویوں کے اقتدار کو ختم کرنے اور اپنی حکومت کے قیام کے لئے اہل خراسان اور ایرانیوں سے استمداد کی اور پھر انہیں کی کوششوں سے عباسیوں کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتِ عباسیہ میں ابتدا ہی سے غیر عرب اور نومسلم اقوام کا اثر و نفوذ شروع ہو گیا اور اس سے ایک نئے فتنہ کا آغاز ہوا۔ یعنی عربوں کی تہذیب و ثقافت جو ابتک بیرونی اثرات سے بڑی حد تک پاک تھی۔ اب اس پہ عجمی اور غیر اسلامی علوم و افکار غالب آنے لگے۔ یہ اتنا بڑا فتنہ تھا کہ اس نے مسلمانوں کی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو ایک نئے رخ کی جانب پھیر دیا۔ ایک طرف علماء و مفکرین کا ایک گروہ پیدا ہوا۔ جس نے حکمت قرآنی کے سادہ اور فطری طرزِ استدلال کو فلسفۂ یونان کی موشگافیوں میں اُلجھا دیا۔ اور

اسلامی تصورات جنکی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانی قوائے عمل کے ذریعہ سے تسخیر کائنات کی اپنے اندر کامل صلاحیت رکھتے ہیں۔ فلاطونی تصوریت کی طرح بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اور دوسری طرف اہل تصوف کا ایک گروہ پیدا ہوا جو ایرانی تصوف، ہندی یوگ، اور ویدانت ازم سے متاثر تھا۔ اس نے عملی زندگی کی کشاکش کے مقابلہ میں گوشہ تنہائی کو ترجیح دی۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کو ذکر، مراقبہ اور قطع علائق کی تلقین کی۔ توکل اور تقدیر کا نشہ پلا کر ان کو عملی جدوجہد سے غافل کر دیا۔

بایں ہمہ دولت عباسیہ کے دور متوسط تک مسلمانوں میں وہ تخلیقی اور اجتہادی صلاحیتیں موجود رہیں جو کسی قوم کو زمانہ کے جدید مسائل کے حل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مگر عباسیہ کے آخری دور میں یہ چیز بھی باقی نہ رہی۔

عثمانی سلطنت کا قیام اسوقت ہوا جبکہ اسلامی تہذیب امویوں اور عباسیوں کی مسلسل مصلحت کوشیوں اور غرض پرستیوں کی وجہ سے جاں بلب تھی۔ اور دولت عباسیہ کے سقوط کے وقت ملت کا اقتدار سیاست تیرہ مراکز میں تقسیم ہو چکا تھا۔ قریبًا ایک سو سال بعد عثمانیوں نے مسند قیادت سنبھالی اور عباسیوں کا پروردہ یونانی فلسفہ، ایرانی تصوف، اور اسی عہد کی فقہ و کلام ہی وہ تہذیبی اور ثقافتی ورثہ تھا، جو انکے ہاتھ لگا۔ اور ترک خود اسلامی فکر و عمل کے اعتبار سے حدیث العہد تھے۔ انہوں نے اسی تہذیبی سرمایہ پر قناعت کی۔ وہ بلاشبہ دلیر، جنگجو، فاتح، سادہ فطرت

اور دیندار تھے۔ مگر ان میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہ تھی کہ اسلامی تہذیب کو غیر اسلامی علوم و افکار کی آمیزش سے پاک کرتے۔ اور علوم وفنون کو جدید حالات اور جدید ماحول کے مطابق وسعت دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف ترک تھے جو پرانی لکیر کو پیٹتے چلے آرہے تھے اور دوسری طرف اقوام مغرب تھیں، جو جدید علوم و فنون کی مدد سے زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھا جانے کا عزم کر چکی تھیں۔ جب ان دو قوتوں سے تصادم ہوا تو اس کا وہی نتیجہ ہوا جو کمزور اور طاقتور کے باہم مقابلہ کا ہو سکتا ہے۔

ہندوستان کی اسلامی حکومتوں میں قریب قریب وہی مفاسد پائے جاتے تھے۔ جو متذکرہ بالا دولِ اسلامیہ میں تھے یعنی ان حکمرانوں کی سیاست ہمیشہ اسلام اور ملت کے عمومی مفاد کے علی الرغم خاندانی اور نسلی مفادات کے گرد چکر کاٹتی رہی۔ اور ثقافتی اعتبار سے ان کی حالت ترکوں سے مختلف نہ تھی۔

یہ تو اُسوقت کی حالت ہے جبکہ مسلمان کاملاً آزاد تھا۔ اور دنیا میں اسکو اقتدارِ اعلیٰ اور امامتِ اقوام کا منصب حاصل تھا مگر اٹھارہویں صدی میں جبکہ مسلمانوں کے اکثر ممالک اہل مغرب کی محکومی میں چلے گئے تو اسوقت سے اسلامیانِ عالم نے ایک نئے دور میں قدم رکھا۔ یعنی اب ایک طرف ان کے قدیم مفاسد تھے۔ جنکو دورِ غلامی نے پختہ تر کر دیا۔ اور دوسری طرف اقوام مغرب کی مادہ پرستانہ تہذیب کے غلبہ و استیلا

نے ان کو ہلاکت آفریں ذہنی اور فکری طوائف الملوکی میں مبتلا کر دیا ؎

باطنِ ایں عصر را نہ شناختی
داد اوّل خویش را در باختی

گذشتہ مباحث سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملت اسلامیہ کے تمام مفاسدِ اجتماعیہ کا بنیادی اور حقیقی سبب ان کے اجتماعی اور ملی شعور کا ضعف و اضمحلال ہے۔ اور اسی سے کئی دوسرے اضافی اور خارجی اسباب پیدا ہوتے چلے گئے ہیں۔

تعمیر و ارتقائے تمدن کے دو متضاد نظریئے

عصر حاضر میں جب تعمیر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے عام طور پر نہایت سطحی اور محدود معنی مراد لئے جاتے ہیں۔ یعنی معاشرہ کی اقتصادی بدحالی کو دور کرنے کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنا جن سے پیداواری قوتوں میں اضافہ ہو یا ملک کی تعلیمی حالت کو سدھارنے کی خاطر ہر جگہ درسگاہیں کھولنا جس سے ملک کا ہر فرد لکھنے پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اور اس تعمیری جدوجہد کا آخری مقصد یہ ہے کہ ملک کی اجتماعی خوشحالی میں اضافہ ہو۔ کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے۔ اور ملک کا ہر باشندہ اتنا پڑھ لکھ جائے کہ کچھ نہ کچھ اجتماعی شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ کے ساتھ ملکی معاملات میں حصہ لے سکے۔

عام طور پر پس ماندہ ممالک میں تعمیر کا مفہوم و مصداق اتنا ہی ہے لیکن زمانہ حال کے ترقی یافتہ اور متمدن ممالک میں تعمیر کی اصطلاح بھی ترقی یافتہ ہے۔ یعنی ان ممالک کے باشندوں کو چونکہ اقتصادی خوشحالی اور تعلیمی ترقی حاصل ہے۔ اسلئے ان کے سامنے تعمیری پروگرام یہ ہے کہ ملکی صنعت و حرفت کو اتنا فروغ دیا جائے جس سے دنیا کے کمزور اور

پیسما نمالک کی دولت زیادہ سے زیادہ مقدار میں سمیٹی جا سکے۔ اور انکے گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے ملک کی عیش و نشاط کا سامان بے پاس سے وہ تباہ کن اور ہلاکت آفریں آلاتِ حرب تیار کئے جائیں۔ جو انسانی آبادیوں کو چند لمحوں کے اندر تہ و بالا کر دیں۔

تعمیر کے پہلے مفہوم اور دوسرے مفہوم میں صرف مدارج کا فرق ہے۔ لیکن اصل حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی یہ دونوں مفہوم تعمیر کے مادی تصور پر مبنی ہیں۔ اور پہلا مفہوم اگرچہ کچھ محدود اور بے ضرر ہے۔ مگر اسکی تکمیل کے بعد لازماً دوسرے کی ابتدا ہوتی ہے۔

تعمیر و ارتقا کا مادی تصور

مادی تصور تعمیر کا طبعی اور فطری اقتضا یہ ہے کہ اس سے انسان کے جسم و روح کی صلاحیتوں میں توازن قائم نہیں رہتا۔ مادی خواہشات اسکی روحانی طلب و جستجو کی راہ میں سنگِ گراں بن جاتی ہیں۔ جس سے وہ انسانی شکل و صورت میں جنگل کے درندوں سے زیادہ خونخوار اور سفاک بن جاتا ہے اسکی وحشت و بہیمیت سے انسانی آبادیاں ویرانوں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور اسکی سختِ دلی اور قساوتِ قلبی ننھے ننھے بچوں سے انتقام لیتی ہے۔ وہ اس معصوم اور ناکردہ گناہ مخلوق کو چیرنے اور پھاڑنے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ عصمت مآب بہو بیٹیوں کی عصمت دری سے وہ اپنے ذوقِ معصیت کو تسکین دیتا ہے۔ اور خدا کی اس کمزور و بے بس مخلوق کے پیٹ چاک کرنے میں اسے مزا آتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ تاریخ

انسانی کی ابتدا سے آج تک انسانیت کو جس قدر ہولناک مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور خدا کی اس زمین پر قتل و غارت۔ وحشت و بہیمیت ظلم و قہر اور انسانی تباہی و بربادی کے جتنے خونی معرکے آج تک بپا ہوتے رہے ہیں، وہ اسی مادی تصورِ تعمیر و ارتقار تمدن کے کرشمے ہیں جسکو قرآن حکیم فساد فی الارض، علو و استکبار، ضلالت، فسق و فجور، طغیان لمہ النسی، اتباعِ ہوائے نفس۔ اور اس قسم کے دوسرے ناموں سے تعبیر کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں امم سابقہ کے واقعات و نظائر اسی لئے بیان ہوئے ہیں تاکہ آنے والی انسانی نسلوں کے لئے اُن خطا کار اور مجرم اقوام کی راہ فکر و عمل متعین اور واضح ہو جائے۔

وکذالك نفصل الایات	ہم اسی طرح کھول کھول کر آیات بیان
ولتستبین سبیل المجرامین	کرتے ہیں اور تاکہ خطا کاروں کی راہِ عمل
(الانعام)	واضح اور متعین ہو جائے۔

— انسان کو ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور نوامیسِ فطرت کی رعایت کیلئے مجبور کرنے والی ایک ہی چیز ہے۔ یعنی اسکی روحانی صلاحیت! جب اس صلاحیت کے مطالبات کو پس انداز کر دیا جاتا ہے تو اس سے ضلالت و غوایت، انسانیت کشی، قساوتِ قلبی، توہینِ آدمیت، خود غرضی، بد دیانتی، شورش و بدامنی۔ اور تمام دوسرے مفاسد اجتماعیہ پیدا ہوتے ہیں جن سے خدا کی مقدس زمین فتنہ و فساد سے بھرپور ہو جاتی ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ — بر اور بحر (خشکی و تری) میں لوگوں کے

بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ۔ اپنے اعمال کی وجہ سے فساد پیدا ہوا

(العنکبوت)

اور آج بھی دنیا کی اقوام میں حسد و رشک کی چنگاریاں سلگ رہی ہیں اور وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہلاکت انگیز اسلحۂ جنگ، زہریلی گیسوں اور تباہ کن آلاتِ حرب کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اسکی وجہ ایک ہی ہوسکتی ہے کہ اقوامِ حاضرہ ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور مقدس اخلاقی قدروں (مارل ویلیوز) سے قطعی محروم ہیں۔ جس سے ہر قوم کے شعور میں یہ مادی خواہش کروٹیں لے رہی ہے کہ وہ پوری زمین کی وسعتوں پر چھا جائے۔ اقوامِ عالم کی قیادت و سیادت اسی کو حاصل ہو۔ اور دنیا کے تمام ممالک میں اسکی ملکی مصنوعات کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو گو اس مقصد کے حصول کی راہ میں اسے انسانی کھوپڑیوں کو روندنا، آبادیوں کو نذرِ آتش کرنا، اور بے گناہوں کے خونِ ناحق میں تیرنا ہی کیوں نہ پڑے۔

مگر کیا یہ مادہ پرست اور خود غرض قومیں فساد و استکبار اور تخریبِ انسانیت کے قدرتی نتائج سے بچ سکتی ہیں؟ اس کا جواب آپ کو قرآن حکیم ہی سے مل سکتا ہے

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ — کیا بے خطر ہوگئے ہیں وہ لوگ، جو بری تدبیریں کرتے ہیں اسبات سے کہ دھنسادے اللہ تعالیٰ انکو زمین میں یا آپہنچے ان کو

لَا يَشْعُرُوْنَ ۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۔ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ۔ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ (النحل)	عذاب اس جگہ سے کہ وہ نہیں جانتے یا پکڑلے ان کو چلتے پھرتے۔ پس وہ خدا کو عاجز کرنے والے نہیں ہیں یا ان کو خوف کی حالت میں پکڑلے۔ بے شک تمہارا رب بڑا شفیق اور مہربان ہے۔
وَسَكَنْتُمْ فِيْ مَسٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَضَرَبْنَا لَكُمُ الْاَمْثَالَ ۔ (سورہ ابراہیم)	تم ان لوگوں کے گھروں میں سکونت کرتے ہو جنہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا اور تمہارے لئے ظاہر ہو چکا ہے کہ ہم نے ان ظالم لوگوں سے کیا سلوک کیا۔ اور ہم نے تمہارے لئے مثالیں بیان کر دی ہیں۔
قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (النحل)	ان لوگوں نے بھی مکر کیا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔ پس آیا اللہ کا عذاب انکے مکانوں کی بنیادوں سے۔ پس گر پڑی انکی چھت ان کے اوپر سے۔

ان آیات قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدرت کا عمل مکافات اس دنیا میں بھی برابر کارفرما ہوتا ہے۔ اور اقوام دنیا اپنے نیک یا بد اجتماعی کردار کی وجہ سے فلاح وسعادت یا ہلاکت و بربادی کا ثمرہ پاتی ہے۔ خدائے قدوس چونکہ ظلم و ناانصافی سے پاک ہے اسلئے یہ بات ہرگز ممکن نہیں ہے کہ وہ نیک قوموں کو مقام سعادت و شرف سے محروم رکھے

اور بُری قوموں کو اُن کے خلافِ فطرت اور ننگِ آدمیت اعمال کی سزا نہ دے یا ان دو قسم کی قوموں سے ایک جیسا سلوک کرے۔

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ۔ (سورہ ص)

کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور اچھے کام کرتے ہیں ان لوگوں کے برابر رکھیں گے جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یا متقین کو فجار کے برابر رکھیں گے؟

اَفَمَنْ کَانَ مُؤْمِنًا کَمَنْ کَانَ فَاسِقًا۔ لَا یَسْتَوٗنَ (السجدہ)

کیا جو شخص مومن ہے اُس شخص کی طرح ہے جو فاسق ہے۔ یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ کَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ (الانعام)

کیا جو شخص کہ مردہ تھا، پس ہم نے اسکو زندہ کیا اور اسکے لئے نور پیدا کیا جس سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس شخص کی طرح ہے جو اندھیروں میں گم ہے۔ اور ان سے نکلنے کی قدرت نہیں رکھتا؟

ہمیں اس بات پر اصرار نہیں ہے کہ ان باتوں کو محض مذہبی تقدس کی بنا پر تسلیم کر لیا جائے۔ بلکہ ہم اصحابِ فہم وبصیرت کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ عقل و دانش اور تاریخی واقعات و نظائر کی روشنی میں اس مسئلہ پر گہری نگاہ ڈالیں کہ کیا قرآن حکیم نے انسانی فلاح و سعادت اور مسائلِ زندگی کا جو حل پیش کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے؟ اور کیا اقوامِ حاضرہ کے

اجتماعی اعمال فساد و تخریب میں اُن تاریخی اقوام جیسے نہیں ہیں، جو اپنی بداعمالیوں اور غلط کاریوں کی وجہ سے قدرت کے قانون مکافات کی زد میں آئیں؟ اور کیا اس مادہ پرستی اور خود غرضانہ رجحانِ عمل عمل کا طبعی نتیجہ وہی نہیں ہے جو قرآن حکیم نے متعدد مرتبہ بیان کیا ہے؟ اگر عقل و تاریخ بھی اس معاملہ میں قرآن کے ہمنوا ہیں اور خود ان اقوام کا مشاہدہ اور عملی تجربہ بھی اس بات کی بین شہادت ہے کہ ان کی مادہ پرستی ان کو ہلاکت و بربادی کے جہنم کی طرف کشاں کشاں لے جا رہی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اسی پرخطر راستہ پر سرپٹ دوڑی جا رہی ہیں۔ اور وہ کون سی چیز ہے جس نے ان قوموں کو نیک و بد کی تمیز سے محروم کر دیا ہے۔ اور اب تک اسی مکروہ اور بھیانک اجتماعی کردار کو خوبصورت ہی سمجھ رہی ہیں؟ یہ چیز وہی ہے جس کو قرآنِ عزیز نے "تزیین شیطانی" سے تعبیر کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا اِلٰی اُمَمٍ مِّنْ	اور ہم نے رسول بھیجے پہلی قوموں کی
قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ	طرف۔ پس ہم نے (انکے کفر و انکار پر)
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ	ان کو مصیبت و درد میں مبتلا کیا، تاکہ وہ
فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا	عاجزی کریں۔ پس ایسا کیوں نہ ہوا کہ
وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ	جب ان پر ہمارا عذاب آیا تو وہ جھک
لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا	جاتے۔ لیکن ان کے دل سخت ہوگئے تھے
يَعْمَلُوْنَ۔ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا	اور شیطان نے ان کے اعمال کو انکی نظر میں
بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ	خوبصورت بنا دیا تھا۔ پس جب وہ اُس

شَیْءٍ حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔

(الانعام)

پیغام کو بھول گئے۔ جس سے ان کی تذکیر کی گئی۔ کھول دیئے ہم نے ان پر ہر چیز (دولت ورزق) کے دروازے یہاں تک کہ جب وہ ان دی ہوئی چیزوں پر خوش ہونے لگے تو ہم نے ان کو ناگہانی پکڑ لیا۔

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا۔ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

(الکہف)

کیا ہم آپ کو ان لوگوں کا حال بتائیں جو اعمال میں نقصان اُٹھانے والے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جنکی کوشش حیات دنیوی میں گم ہوگئی ہے۔ اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم اچھا کر رہے ہیں۔

اگر اس مسئلہ پر کچھ گہری نظر سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت از خود ہی اُبھر کر سامنے آجائیگی کہ زندگی کا مادی تصور اپنی طبیعت اور مزاج سے انسانی افراد و جماعات میں حسد، رشک، بغض و عناد، علو و استکبار، زینت و تجمل کی خواہش، خود غرضی، جذبۂ تذلیلِ انسانیت۔ اور تمام معاشرتی و معاشی مفاسد پیدا کرتا ہے۔ اور اس سے انسانی قلوب میں باہم نفرت و کدورت، معاشی و سیاسی برتری کی مجنونانہ خواہش روز افزوں بڑھتی ہی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسی مادہ پرست اقوام میں شرف و فضیلت کا معیار ہی کثرتِ دولت، قوت و شوکت کی نمائش، اور حسن و تجمل کا اظہار ہوتا ہے۔ اور انکی نظر میں وہ تمام لوگ ذلیل ہوتے ہیں جو انکے خود ساختہ

معیارِ شرف پر پورے نہ اترتے ہوں۔ قرآن حکیم نے ان لوگوں کے رجحانِ طبیعت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَۃٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْھَا اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِہٖ کٰفِرُوْنَ ۔ وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ۔

(السبا)

ہم نے جب بھی کسی بستی میں پیغمبر بھیجا تو اسکے خوشحال اور دولت مند لوگوں نے کہدیا کہ ہم اس پیغام کا انکار کرتے ہیں۔ جو آپ لیکر آئے ہیں۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم مال و اولاد میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہوگا۔

وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِہٖ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْکُ مِصْرَ وَ ھٰذِہِ الْاَنْھٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ھٰذَا الَّذِیْ ھُوَ مَھِیْنٌ وَّلَا یَکَادُ یُبِیْنُ ۔

(الزخرف)

فرعون نے اپنی قوم میں یہ آواز بلند کی اے میری قوم! کیا میرے لئے مصر کی حکومت نہیں ہے اور یہ نہریں ہیں جو میرے نیچے سے بہہ رہی ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ کیا میں اُس شخص سے (حضرت موسیٰ) بہتر نہیں ہوں جو ذلیل ہے اور اچھی طرح کھل کر بات بھی نہیں کر سکتا۔

تعمیر و ارتقاء کا قرآنی تصور

حیاتِ انسانی کی حرکتِ ارتقاء میں اگر روحانی اور جسمانی قوتوں کو ساتھ ساتھ بڑھنے کا موقع دیا جائے تو اس سے جو صالح اور بے ضرر نظامِ تمدن معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اس میں صرف اتنا ہی نہیں کہ جماعتِ انسانی مادی لحاظ سے

خوشحال اور علم وفن کی مدد سے کائنات کی تسخیر پہ قادر ہوتی ہے۔ بلکہ اسکے ساتھ وہ احترامِ آدمیت، اُنس ومحبت، دیانت وصداقت، تقوی وطہارت، اور دیگر اعلیٰ وپاکیزہ صفات کی بھی حامل ہوتی ہے۔ اس معاشرہ میں ہر فرد کو مساوی طور پہ آگے بڑھنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ اور جماعت کے تمام افراد ایک کنبہ کی طرح دکھ درد میں ایک دوسرے کے شریکِ حال ہوتے ہیں۔ کسی کو کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہاں ظلم وناانصافی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ ایک کی مصیبت سب کی مصیبت ہوتی ہے۔ نیز اس معاشرہ میں زمیندار اور کسان یا کارخانہ دار اور مزدور کی تقسیم ہے اور نہ معاشرتی طور پہ اونچ نیچ کا امتیاز ہے۔ بلکہ تمام افرادِ جماعت میں اخوت انسانی کا مقدس جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔

تعمیر وارتقا تمدن کا قرآنی تصور اقوام دنیا کے مادی تصورِ تعمیر کی طرح ناقص اور ادھورا نہیں ہے کہ نفس وروح کی پاکیزہ صلاحیتوں سے غافل ہو اور جسم ومادہ کی خواہشات کو بے لگام چھوڑ دے۔ بلکہ وہ انسان کی تمام روحانی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو اجاگر کرکے ایک متوازن، اور معتدل نظامِ تمدن اور پاکیزہ وبے ضرر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم ارسالِ رسل اور انزالِ کتب کا مقصد ہی یہ بیان کرتا ہے، کہ جب کسی انسانی جماعت کا اجتماعی کردار بگڑ جاتا ہے اور وہ نقطۂ اعتدال سے دور ہٹ جاتی ہے تو خدائے قدوس اسکے نظام اجتماع وتمدن میں توازن قائم کرنے کے لئے انبیاء ورسل کو بھیجتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (الحدید)

بے شک ہم نے اپنے رسول دلائل و براہین کے ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ہمراہ ہم نے کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ (غلط راہوں سے ہٹ کر) نقطۂ اعتدال پر کھڑے ہو جائیں۔

انسانی جماعت میں جب بھی فساد و اختلال رونما ہوا۔ اسکا بنیادی سبب انسانی تاریخ میں ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ یعنی سب سے پہلے اس کے انداز فکر میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ زندگی کے اہم اور ضروری تقاضوں سے اسکی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ اور محض خرافات و اوہام یا مادی خواہشات کو اپنا کعبۂ مقصود بنالیتی ہے۔ اس طرح بہ تدریج اسکی زندگی کا نقطۂ نظر بالکل بدل جاتا ہے۔ اور یہیں سے اسکے نظام تمدن میں بدنظمی اور بداعتدالی کا ظہور ہوتا ہے۔ اور پھر آگے چل کر اس کا یہ نیا نظریۂ تمدن اتنا گہرا اور اتنا پختہ ہو جاتا ہے کہ اب اس میں نیک و بد اور غلط و صواب کی تمیز کی قوت ہی مفقود ہو جاتی ہے۔ اور وہ خدا کے بھیجے ہوئے مقدس انبیاء و رسل کی دعوتِ اصلاح و تعمیر کا مذاق اُڑاتی ہے۔ اور اپنے مادی تفوق کو اپنے نظریۂ زندگی کی صداقت کے لئے بطور سند پیش کرتی ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ

اہل کفر نے اہل ایمان سے کہا، اگر اسلام کوئی بہتر چیز ہوتی تو یہ لوگ اس میں ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔ اور جب ان کو

فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْکٌ قَدِیْمٌ — انکی ہدایت میسر نہیں آسکی تو یہ کہیں گے کہ یہ پرانا جھوٹ ہے۔ (حم)

وَقَالُوْا نَحْنُ اَکْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ — انہوں نے کہا کہ مال و اولاد میں بڑھے ہوئے ہیں اور ہمکو عذاب نہیں ہوگا۔

بلکہ انبیاء و رسل کے مقابلہ میں اپنے علم و فہم اور عقل و دانش پہ اترانا شروع کر دیتے ہیں۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔ (المومن) — پس جب ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل کے ساتھ آئے تو وہ اپنے علم و عقل پہ اترانے لگے۔

جیسا کہ آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ عصر حاضر میں علم و فن اور سائنس کی حیرت افزا وسعت و ترقی نے انسان کو انسانیت و اخلاق اور مذہب و روحانیت کی تمام اعلیٰ قدروں سے منحرف کر دیا ہے۔ اور اپنے علمی و سائنسی اکتشافات پر ہی نازاں ہیں۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ انسانی عقل ہی عقدۂ زندگی کو حل کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور جو باتیں ان کے فہم و عقل کی حد رسائی سے بالاتر ہیں، وہ علم و سائنس کے اس سائنٹیفک دور میں ناقابل تسلیم ہیں۔ مگر آج انکی علمی اور عقلی کاوشوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ قیام امن اور معاشرہ کی اصلاح کے لئے ان کی تمام تدبیریں بے اثر اور ان کے تمام منصوبے ناکام رہتے ہیں۔ بلکہ انکی ہر نئی تدبیر صدہا نئی الجھنیں پیدا کر دیتی ہے۔ اور ہر نئے منصوبہ سے نئے نئے فتنوں کی بھرمار

شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں تو چاروں طرف یاس
و نومیدی کی تیرہ و تار گھٹائیں ان کے سروں پر منڈلا رہی ہوتی ہیں۔ اور
اس طرح ان کی سالہا سال کی محنت چند لمحوں میں ضائع ہو جاتی ہے ایسا
کیوں ہوتا ہے؟

ذَالِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهٗ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ۔ (سورہ محمدؐ)

اسلئے کہ جس چیز کو خدا ناپسند کرتا ہے یہ لوگ اسکا پیچھا کرتے ہیں اور جس چیز کو خدا پسند کرتا ہے، اسکو وہ برا سمجھتے ہیں پس اللہ تعالےٰ ان کے کئے کرائے کو ضائع کر دیتا ہے۔

چونکہ انسانی جماعتوں کا اجتماعی فساد ان کے طریق فکر سے شروع
ہوتا ہے۔ اسلئے انبیاء علیہم السّلام کی انقلابی دعوت پہلے قلوب اذہان
ہی سے ابتدا کرتی ہے۔ اور اسکے بعد خارجی احوال و شئوُن کی اصلاح
اور نظام تمدن کی تعمیر کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ پہلے عمل کا نام تطہیر
فکر اور تزکیۂ نفس ہے۔ اور دوسرے کا نام تعمیر ہے۔ پہلے عمل کے سوا دوسرا
عمل کبھی پائدار اور مستقل نتائج نہیں پیدا کرتا، اور نہ ہی وہ فلاح انسانیت
پر منتج ہوتا ہے۔ بلکہ وہ انسانوں کو ایک مصیبت سے نکال کر اس سے
بڑی مصیبت میں ڈال دیتا ہے۔

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ

کیا وہ شخص جو بنیادیں اُٹھائے اپنی عمارت کی اللہ کے خوف اور اسکی رضامندی پر

امن اسس بنیانہ علے شفا جرفٍ ھارٍ فانھار بہ فی نار جھنم، واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔

(التوبہ)

بہتر ہے۔ یا وہ شخص جو بنیادیں اُٹھائے اپنی عمارت کی گرنے والی رودخورہ زمین کے کنارہ پر، بس لے گرے اسکو بھی دوزخ کی آگ میں۔ اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا۔

(سورہ شمس)

وہ شخص فلاح پاتا ہے جس نے نفس کو پاک و مطہر کر لیا۔ اور وہ ذلیل و رسوا ہوتا ہے جس نے نفس کو گندگی سے آلودہ کیا۔

حقیقی انقلاب کے معنی ہی یہ ہیں کہ انقلاب کے بعد کی زندگی پہلے سے بالکل جدا اور مختلف ہو جائے۔ اور قوم فکر و عمل کے اعتبار سے ایک نئے سانچے میں ڈھل جائے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انقلابی جدوجہد قلوب و اذہان کی تطہیر سے شروع ہو۔

پس نخستیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازاں آساں شود تعمیر فکر

پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب

اور اسکے اصول و مبادی

فن سرجری کا ماہر ڈاکٹر جب جسم کے ناسور کا اپریشن کرتا ہے تو اسکی تمام تر توجہ دو باتوں میں سمٹ جاتی ہے۔ایک یہ کہ جسم کا کوئی صالح اور صحت مند حصّہ اسکے عمل جراحی کی زد میں نہ آجائے۔ اور دوسرے یہ کہ متعفن اور سمیت آلودہ مادہ کا کوئی ذرہ جسم کے اندر باقی نہ رہ جائے جسکے جراثیمی تعدیہ سے جسم کے دوسرے حصے متاثر ہوجائیں جو ڈاکٹر ان دو باتوں یا ان میں سے کسی ایک سے بے اعتنائی کرتا ہے، وہ مریض کو اس ہلاکت آفریں مرض کے چنگل سے بچانے میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتا۔

حضرات انبیا علیہم السّلام کو مریض معاشرۂ انسانی کے علاج کے لئے خدا کی طرف سے بھیجا جاتا ہے۔ اور ان کی دور رس نگاہ پہلے مرحلہ پر ہی معاشرہ کے تمام فکری، ذہنی، روحانی اور عملی اسقام و مفاسد کا جائزہ لیتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے وہ تمام خارجی مفاسد کے اصل سرچشمہ یعنی لادینی رجحانِ فکر کی ٹوہ لگاتے ہیں۔جس سے تمام عملی مفاسد پھوٹ پھوٹ

کر نکلتے ہیں۔ اور اسکے بعد معاشرہ کے خارجی احوال و شئون کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ اسکی معیشت و معاشرت اور سیاست و اجتماع کے طرز و طریق میں جہاں جہاں ان کو خرابی نظر آتی ہے۔ اسکو چن چن کر سامنے لاتے ہیں۔ اور اسکی اصلاح و تبدیلی میں پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اور پہلے سے جو اچھی چیزیں اس میں موجود ہوتی ہیں، اُن کو جوں کا توں باقی رکھا جاتا ہے۔ پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب کے اس اصولی طریق کار سے ایک صالح، صحت مند، مہذب اور مثالی معاشرہ انسانی معرض وجود میں آتا ہے۔

تنظیم جماعت

پہلے مرحلہ پر نبی کا کام انسانی قلوب کو وساوس داوہام اور شکوک وشبہات سے پاک کر کے ان کو ایک مقدس تر اور واضح تر اخلاقی مقصدِ حیات سے متعارف کرنا اور بتدریج اسکے رحجانِ فکر اور شعور ذہنی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ جو لوگ اس نئی انقلابی جماعت کے رکن بنتے ہیں ان کو پہلے ہی دن یہ بتا دیا جاتا ہے کہ ابھی سے تمہیں زندگی کا نقطۂ نظر بدلنا ہوگا۔ فکر و ذہن میں تبدیلی پیدا کرنی ہوگی۔ اور اس جدید تصور زندگی کے مطابق اپنی سیرت کو ڈھالنا ہوگا۔ اس آئینی معاہدہ (بیعت) سے وہ جماعتِ مسلمہ کی رکنیت اختیار کرتے ہیں۔ اور اس طرح چند پاکیزہ نیک سیرت اور بالغ النظر انسانوں کی ایک مختصر سی جماعت تیار ہو جاتی ہے۔ جو اپنے اعلیٰ کردار اور حسن عمل کی کشش سے بڑے بڑے مغرور اور متکبر انسانوں

کو اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔

تطہیرِ فکر اور تعمیرِ فکر کے اس دوگونہ اسوۂ نبوت کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُوْلًا	جیسا کہ ہم نے تم میں ہی سے رسول بھیجا
مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ	جو تمکو ہماری آیتیں پڑھکر سناتا ہے۔ تمہارے
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ	دلوں کا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت
وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ	کی تعلیم دیتا ہے۔ اور تمہیں وہ باتیں سکھاتا
(البقرہ)	ہے جو تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

یعنی تزکیۂ نفس اور تطہیرِ فکر کے بعد "الکتاب و الحکمہ" وہ تعمیری لائحہ عمل ہے جس سے فکر و عمل اور سیرت و کردار کی تعمیر ہوتی ہے۔

اخلاصِ مقصد اور تخلیق یقین

خود نبی کو اپنے مقصدِ حیات سے نہایت گہری عقیدت ہوتی ہے۔ نیز اسکو اس بات میں غیر متزلزل یقین ہوتا ہے کہ حیات انسانی کے تمام مسائل صرف اُسی نظریۂ زندگی کے توسط سے حل ہو سکتے ہیں جو خدا کی طرف سے اُسکو ملا ہے۔ اسلئے وہ پورے عزم و ایمان کے ساتھ لوگوں کے سامنے اسکا اعلان کرتا ہے۔ مصائب و آلام کی آندھیاں آتی ہیں۔ رنج و بلا کے طوفان اُٹھتے ہیں۔ کہیں قتل کی دھمکیاں دیجاتی ہیں۔ اور کہیں جلاوطنی کے منصوبے ہوتے ہیں۔ قوم کا بچہ بچہ جانی دشمن بن جاتا ہے۔ گالیوں اور طعنوں کی ہر طرف سے بوچھاڑ ہوتی ہے۔ مگر نبی کے عزم و ارادہ کا یہ حال ہے کہ وہ پہاڑ

کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ۚ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَإِ الْمُرْسَلِينَ۔ (الانعام)

آپ سے پہلے بھی رسولوں کو جھٹلایا گیا پس انہوں نے جھٹلائے جانے اور اذیت دیئے جانے پر صبر کیا یہاں تک کہ ان کو ہماری مدد پہنچ گئی۔ اللہ کے فیصلوں کو کوئی تبدیل کرنے والا نہیں ہے۔ اور بلاشبہ رسولوں کے واقعات آپ تک پہنچ چکے ہیں۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کے ایمان و یقین کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی مسلسل ایذا رسانی، پیہم تکذیب و تضحیک اور اپنی تنہائی و بے سر و سامانی کے باوجود ان الفاظ میں اپنے عزم و یقین کا اعلان کرتے ہیں۔

يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ۔ (یونس)

اے میری قوم! اگر میرا منصب اور میرا تم کو نصیحت کرنا، اللہ کی آیات سے تم پر گراں گزرتا ہے، تو میں صرف اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں۔ پس تم اپنے معبودوں کو ساتھ لیکر اپنے معاملہ کو ٹھیک کر لو۔ تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ نہ رہے۔ پھر تم میرا فیصلہ کر دو اور مجھے مہلت نہ دو۔

آنحضرت صلعم نے اپنی تیرہ سالہ مکی زندگی میں قریش کے ہاتھوں جو مظالم

ہے ان کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں ایسا کون ہو گا، جس نے اتنی طویل مدت تک ایسے کینہ پرور دشمنوں میں رہ کر مسلسل جگر خراش آلام و مصائب برداشت کئے ہوں۔ مگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا دامنِ صبر ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو۔ اتنا ظلم و تشدد کہ خود خداوند تعالےٰ آپ کے مصائب کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کرتے ہیں۔

لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ۔ اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ کچھ نہ کچھ ضرور ہی ان کی جانب جھک جاتے۔

حق یہ ہے کہ یہ عشق و مستی کا وہ مقام ہے جہاں جسمانی اذیتوں اور حوصلہ شکن مصائب کا بطیب خاطر استقبال کیا جاتا ہے۔ ؎

عشق بازی را تحمل بایدائے دلِ عشق باز
گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

آپ جس سرزمین میں رہتے ہیں وہاں ہر طرف سے آپ کی دعوت میں رکاوٹیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ آپ کا اور آپ کے پیروؤں کا یہ کہہ کر مذاق اُڑایا جاتا ہے کہ دیکھو ان کا حال کیا ہے کہ کھانے کو روٹی نہیں ہے اور پہننے کو کپڑا نہیں ہے۔ اور ان کی باتیں سنو تو روئے زمین کی حکومت و خلافت کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ غرض قدم قدم پر روح فرسا اور ہمت شکن حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ مگر دشتِ بلا کی ہر ٹھوکر سے ان کے عزم و ایمان میں پختگی اور قدم ہمت میں ثبات و استقلال پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ؎

وادیِ عشق اگر دور دراز ہست نہ لے
طے شود جادہ صد سالہ بہ آہے گاہے

نبی کا سینہ ابتدا ہی سے نورِ ایمان سے منور ہوتا ہے۔ لیکن اہلِ زمانہ کے عمل و کردار کی ظلمت جسقدر تیز اور گہری ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی قدر اسکی نگاہِ حقیقت شناس نمودِ صبح کی جلوہ پاشیوں کو قریب تر دیکھتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کو تحمل شدائد سے دکھ نہیں ہوتا۔ بلکہ لذت محسوس ہوتی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَشْتَہِیْٓ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْہَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ۔

بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہی ہے۔ اور پھر اس قول پر مضبوطی سے ڈٹ گئے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (جو ان سے یہ کہتے ہیں) ڈرو نہیں اور نہ غم کھاؤ، اور جس جنت کا وعدہ تم سے کیا گیا ہے اس پر خوشی مناؤ۔ ہم دنیا اور آخرت میں تمہارے مددگار ہیں۔ اور تمہارے لیے جنت میں سب کچھ ہے جسکی تم خواہش رکھتے ہو اور جو کچھ تم مانگتے ہو، یہ بخشنے والے اور رحم کرنے والے خدا کی طرف سے مہمانی ہے۔

حضرت خبابؓ، جناب رسالت مآب صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر

رنج و آلام کا شکوہ اور آپ سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ ان ستم رسیدہ اور مظلوم انسانوں کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

قال کان الرجل فی من کان قبلکم یحفر له الارض فیجعل فیه فیجاء بالمنشار فیوضع علی راسه فینشق وما یصده ذالك عن دینه ویشط بامشاط الحدید ما دون لحمه من عظم وعصب وما یصده ذالك عن دینه ۔ واللہ لیتمن ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعا الی حضر موت لا یخاف الا اللہ ولکنکم تستعجلون۔

(البخاری)

تم سے پہلے ایسے لوگ ہو گذرے ہیں، کہ زمین میں گڑھا کھود کر ان کو اس گڑھے میں لٹا دیا جاتا اور پھر انکے سر پر آرا رکھ کر انکو چیر دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ آزمائش انکو دین سے نہ پھیر سکتی تھی۔ ان کے جسم میں لوہے کی کنگھی کے دندانے اس طرح چبھوئے جاتے کہ وہ گوشت سے نیچے اتر کر ہڈی اور پٹھوں کو چھلنی کر دیتے تھے۔ لیکن یہ مصیبت بھی ان کو راہ حق سے نہ پھیر سکتی تھی خدا کی قسم یہ امر (اسلام) مکمل ہو کر رہے گا اور (اسطرح ہمہ گیر امن قائم ہو گا) کہ سوار صنعا سے حضر موت تک چلا جائیگا اور اسکو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا لیکن تم بہت جلدی کرتے ہو۔

یہ تو خود انبیا علیہم السّلام کا حال ہے۔ لیکن جو لوگ سچے دل سے حضرات انبیا پر ایمان لاتے ہیں، ان کو بھی کچھ ایسا ہی ذوق یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مقصد حیات کی راہ میں پیش آنے والی بڑی سے بڑی

آزمائش کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کلمۂ حق کے اعلان و اظہار میں اتنے بے باک ہوتے ہیں کہ دنیا کے بڑے بڑے مغرور و متکبر انسان ان کی نگاہ میں نہیں بچتے۔ اور وہ بے خوف و خطر ان کے پر ہیبت درباروں میں گھس جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ ایمانی سے ان ظالم و جابر حکمرانوں کے پر شکوہ تخت و سریر لرز اٹھتے ہیں۔ ؎

با سلاطین درفتد مرد فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر

ان کی ضرب لاالٰہ سے بتان باطل ریزہ ریزہ اور ان کے ہاتھوں سے ارباب اقتدار کی قبا کہنہ چاک چاک ہو جاتی ہے۔

درجہات آزاد از بند جہات ریزہ ریزہ از ضرب او لات و مناتؔ
قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او

مصر کا مغرور اور متکبر بادشاہ اپنے تمام لاؤ لشکر کے ساتھ کھڑا ہے اسکی ہیبت و شوکت سے لوگوں کے دل لرز رہے ہیں۔ نظریں سہمی ہوئی ہیں۔ رگوں میں خون خشک ہو رہا ہے۔ اور کسی کو اسکے سامنے لب کشائی کی جرأت نہیں ہے۔ اس حالت میں اسکی نگاہِ غرور اٹھتی ہے۔ اور وہ اپنی قوم کو یوں خطاب کرتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِیْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰی وَلْیَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ اَوْ

فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑو کہ میں موسیٰ کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے رب کو بلا لے، مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دیگا

اَنْ یُّظْهِرَ فِی الْاَرْضِ الْفَسَادَ۔ یا وہ زمین میں فساد کھڑا کرے گا۔

اس اجتماع میں فرعون ہی کی قوم کا ایک خدا شناس انسان بھی موجود تھا جو اگرچہ پہلے سے نورِ ایمان سے منور ہو چکا تھا، مگر اس سے پہلے اس نے اپنے ایمان کو ظاہر نہ کیا تھا۔ فرعون کے ان پرغرور الفاظ کے بعد وہ ضبط سخن نہ کر سکا۔ اب اسکے لئے ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ جس نظریۂ زندگی کو صحیح سمجھتا ہے اسکو دل ہی میں چھپائے رکھے۔ اور زبان سے اسکا اظہار و اعلان نہ کرے۔ یہ وقت بڑا ہی نازک تھا۔ فرعون کی ایک جنبشِ زبان سے اس کا سر قلم کئے جانے کا خطرہ تھا۔ اور وہ بھی جانتا تھا کہ اس وقت حضرت موسیٰ کا ساتھ دینا فرشتہ موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر اس کی خلشِ ایمانی نے اسکو کچھ اس طرح بے قرار و مضطرب کر دیا کہ فرعون کی حشمت و جاہ اور جلال و شکوہ اسکو مرعوب نہ کر سکا۔ چنانچہ یہ مردِ مومن اس موقع پر کھڑا ہو کر فرعون اور اسکی قوم کو خطاب کرتا ہے۔

اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ وَاِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَیْهِ كَذِبُهٗ وَاِنْ یَّكُ صَادِقًا یُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ یَعِدُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔

کیا تم ایسے آدمی کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار صرف اللہ ہے اور وہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلائل و براہین لیکر آیا ہے۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اسکے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑیگا اور اگر سچا ہے تو تم پر اس عذابِ الٰہی کا کچھ حصہ ضرور ہی آپڑیگا جس کا وہ تم سے وعدہ

کرتا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ اُس شخص کو ہدایت
نہیں کرتا جو حد سے بڑھنے والا اور ریب و
(المومن) شک میں مبتلا ہو۔

اس مردِ مومن کو اپنے عقیدہ و مسلک کی صداقت پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ حیرت انگیز عزم ویقین کے ساتھ قوم کو اپنے مسلک کی دعوت دیتا ہے۔

یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔ اے میری قوم تم میرے پیچھے چلو۔ میں تم کو ہدایت کی راہ دکھاتا ہوں۔

اور اس قوم کے انجام کے متعلق بھی وہ کس درجہ محکم اور غیر متزلزل یقین رکھتا ہے۔

فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۔ (المومن)
تم بہت جلد اس بات کو یاد کرو گے جو میں تم سے کہتا ہوں۔ اور میں اپنا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کے حالات کا دیکھنے والا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاؑ جن لوگوں کے ذریعہ انقلاب بپا کرتے ہیں وہ سب چشمۂ نبوت سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ اور اُن کو مقصد سے اس قدر گہری عقیدت ہوتی ہے کہ اسکے لئے جان و مال اور اولاد کی قربانی انکی نظر میں ہر بات سے آسان تر ہوتی ہے۔

تمنت سلیمی ان نموت بحبہا
واھون شیٔ عندنا ما تمنت

تربیت فکر و عمل اخلاصِ مقصد اور تقویتِ یقین کے لئے یہ ضروری ہے کہ افرادِ جماعت کو کچھ ایسے احکام و فرائض کی پابندی کا عادی بنایا جائے جن سے ان کا ذوقِ یقین بڑھے، ان کی عملی صلاحیتوں کو فروغ حاصل ہو۔ جذبہ منفعتِ ذات کمزور، اور اجتماعی و ملی احساس تیز تر ہوتا جائے۔ طبیعتوں میں ضبط و نظم اور سیرت و کردار میں پاکیزگی پیدا ہوتی جائے

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے خدائے قدوس کی طرف سے کچھ عبادات کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ نماز روزہ، زکوٰۃ اور حج بظاہر چند مذہبی رسوم ہیں جن کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن وقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ فکر و عمل کی تربیت کے لئے ایک مکمل نصاب ہے۔ اسلام میں دوسرے مذاہب کی طرح عبادت محض رسوم و آداب کا نام نہیں ہے کہ مندر یا گرجے میں پہنچکر آپ چند مقررہ رسمیں ادا کرنے کے بعد یہ سمجھ لیں کہ لیں اب پرماتما یا خدا ہم سے خوش ہو جائیگا۔ اور اب زندگی کے دوسرے معاملات میں ہماری اپنی مرضی کام کرے گی۔ یعنی اب ہم خدا کی مملکت سے نکل کر انسانی مملکت میں آگئے ہیں۔ اور یہاں خدا کی مرضی کی رعایت رکھنا ضروری نہیں رہا۔

در اصل اسلامی عبادت زندگی کے اجتماعی نظام کا ایک حصہ ہے اور اُسکو ایک لمحہ کے لئے بھی زندگی کے معاملات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ قرآن حکیم نے مطلق عبادت اور خاص خاص عبادات کا جہاں

جہاں ذکر کیا ہے، ان کے مصالح و حکم بھی ساتھ ہی بیان کر دیئے ہیں، جیسا کہ عام عبادت کی نسبت قرآن کریم نے واضح طور پر کہدیا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (زمر)	ہم نے فی الواقع آپ کی طرف کتاب اُتاری ہے۔ پس آپ اللہ کی عبادت کریں۔ اپنے دین کو اسی کے لئے خالص کر کے۔ یاد رکھو کہ دین خالص اللہ ہی کے لئے ہے۔
قل انی امرت ان اعبدالله مخلصا له الدین۔ (زمر)	اے نبی آپ کہدیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں۔ دین کو اسکے لئے خالص کر کے۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اسلام میں عبادت، نظام اطاعت کا ایک حصہ ہے۔ اور جماعت مسلمہ کے ہر رکن سے اسلام یہ مطالبہ کرتا ہے۔ کہ عبادت اور اطاعت کو ایک ہی ذات کے لئے مخصوص کر دے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ عبادت تو اللہ کے لئے ہو اور زندگی کے دوسرے معاملات میں ہوائے نفس یا غیر الٰہی قانون کی اطاعت کی جائے۔ یعنی اسلام آپ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ آپ اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں ایک حصہ تو خدا کے لئے ہو اور دوسرا شیطان کے لئے! بلکہ اسلام آپ سے یہ چاہتا ہے کہ آپ کی پوری زندگی خدا کی مرضی کے مطابق بسر ہو۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً وَّلَا تَتَّبِعُوْا	اے ایمان والو تم داخل ہوجاؤ اسلام میں مکمل طور پر۔ اور شیطان کے نقوش قدم

خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ۔ کا اتباع مت کرو۔

ایک دوسری جگہ عبادت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ (الحجر) پس آپ عبادت کریں اپنے رب کی یہاں تک کہ آپ کو یقین کا اعلیٰ مقام حاصل ہو جائے۔

اسی طرح خاص خاص عبادات کو قرآن حکیم بار بار ذکر کرتا ہے۔ اور ہر مرتبہ ان کی کسی خاص حکمت و مصلحت کو بھی بالوضاحت بیان کرتا ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ۔ اور آپ نماز قائم کریں۔ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے باز رکھتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کو شخصی اور اجتماعی سیرت کی اصلاح و تعمیر میں خاص دخل ہے۔ اور جو نماز انسان کے اخلاق کو بلند کرنے اور سیرت و کردار کی اصلاح و تعمیر سے قاصر ہے۔ وہ حقیقت میں نماز ہی نہیں ہے۔

تسویۂ صفوف کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لتسوُّنَّ صفوفکم او ليخالفنَّ الله بين وجوهكم (ترمذی) تم اپنی صفیں سیدھی کرو گے ورنہ اللہ تعالیٰ تم میں اختلافات پیدا کر دے گا۔

قرآن کریم میں روزہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ اے اہل ایمان تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسے کہ ان لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں تاکہ تم صاحبِ تقویٰ بن جاؤ۔

"تقویٰ" کی اصطلاح قرآن حکیم میں ہر جگہ اور ہر موقع پہ استعمال ہوئی ہے اور اسکا مفہوم اتنا جامع اور اتنا وسیع ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں پہ حاوی ہے۔ اسی سے بلند سیرت اور پاکیزہ اخلاق کی تشکیل ہوتی ہے۔ اسی سے سیاستِ عادلہ اور معیشتِ صالحہ عالم وجود میں آتی ہے۔ اور اسی سے ایک مہذب تر اور صحت مند معاشرہ تیار ہوتا ہے۔

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ۔	اے ایمان والو! تم اللہ سے ڈرو اور ٹھیک ٹھیک بات کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دے گا۔ (سورہ احزاب)

بلکہ اگر تعمق نظر سے دیکھا جائے تو تقویٰ ہی وہ حقیقی طاقت ہے جو انسان کو شرف انسانی کی بلندیوں پہ کھڑا کرتی ہے۔ اسکے اعمال میں اعتدال و توازن قائم رکھتی ہے۔ اور اسکو حقیقی غلبہ و اقتدار عطا کرتی ہے۔

یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّیُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ ۔ (الانفال)	اے ایمان والو اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے فرقان (حق اور باطل میں فرق کرنے والی قوت) پیدا کر دیگا۔ اور تمہاری برائیوں کو تم سے مٹا دیگا۔

زکوٰۃ کی اجتماعی اور ملی حیثیت بالکل ظاہر ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسکو ایک اجتماعی فریضہ قرار دیا ہے۔ اور مرکز ملت کو اختیار دیا ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے کر حسب حاجت و ضرورت مستحقین میں تقسیم کرے۔ اس سے دو قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ملت کے وہ افراد

جو خود کمانے سے معذور ہیں باعزت طریق سے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔ اور وہ دوسروں پر بوجھ نہیں بنتے۔ اسکے نتیجہ کے طور پر معاشرہ میں امکانی حد تک معاشی مساوات رونما ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دینے والے لوگوں میں جذبۂ منفعتِ ذات فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس سے ان کے نفوس کا تزکیہ ہوتا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ۔ (التوبہ)

آپ اُن کے اموال سے صدقہ لیں جو ان کو پاک کریگا۔ اور اُن کے نفوس کا تزکیہ کریگا۔ اور انکے حق میں دعا کریں، آپ کی دعا ان کے لئے باعثِ طمانیت خاطر ہے۔

قال رسول اللہ صلعم تؤخذ من اغنیاءھم و ترد الی فقراءھم

زکوٰۃ مالداروں سے لی جاتی ہے اور اہل احتیاج میں تقسیم کی جاتی ہے۔ (صحاح)

بالکل یہی حال فریضۂ حج کا ہے۔ کعبۃ اللہ مسلمانان عالم کا روحانی اور ملی مرکز ہے اور سال میں ایک مرتبہ تمام دنیا کے مسلمانوں کے سربرآوردہ افراد کا اجتماع ہمہ گیر جذبۂ اخوت اسلامی کی تجدید کرتا ہے۔ اور اس سے بیشمار شخصی، اجتماعی اور ملی نتائج وثمرات پیدا ہوتے ہیں۔ خدائے قدوس نے "قیاما للناس" کے الفاظ میں اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اسکے علاوہ حج کے بارہ میں بھی قرآن حکیم نے "تقویٰ" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا

اللہ کے پاس قربانیوں کے گوشت اور

وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ (حج) خون نہیں پہنچتے بلکہ تمہارا تقویٰ ہی پہنچتا ہے

حاصل یہ ہے کہ اسلامی عبادت سے مقصود بالذات اگرچہ تعلق باللہ کو تقویت دینا ہے۔ لیکن یہ تعلق ایسا نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے شعبے (جو دوسری قوموں میں دین کی گرفت سے آزاد ہوتے ہیں) اس تعلق سے بے نیاز ہوں، بلکہ یہاں پوری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

مصلحت کلیہ کی رعایت معاشرہ کی سیاست و معیشت میں سطحی انقلاب لانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ محض مادی قوت، فوجی حملہ و ہجوم، جبر و تشدد، وحشت و بہیمیت، سیاسی جوڑ توڑ، پارٹی پالیٹکس کے بے مغز دعاوی، اور بعض دفعہ بے مقصد ہنگامہ آرائیوں اور بے حقیقت نعروں سے بھی ایسا انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے لیکن تعمیری انقلاب جو اسوۂ نبوت کے ذریعہ معرض وجود میں آتا ہے انتہائی مشکل اور سخت دقت طلب ہے۔ اس میں سب سے پہلے انسانوں میں انقلابی فکر اور اسلامی ذہن پیدا کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر بہ تدریج پوری زندگی کو بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ اس راہ میں جو عملی مشکلات پیش آتی ہیں ان کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو حقیقی انقلاب اور سطحی انقلاب کے فرق کو سمجھنے کی اپنے اندر صلاحیت رکھتا ہے۔ اور جو اس میدانِ کارزار کا مرد شمشیر زن ہے۔ اور جن لوگوں کے یہاں ہمہ اہتمام تن پروری کی تسکین ہی زندگی کا حقیقی مسئلہ ہے۔ اور ان کا پورا فلسفہ زندگی انہی بنیادوں پر اٹھایا گیا ہے۔ وہ انبیاء علیہم السّلام کی انقلابی مہم کی

حقیقت کو کیا سمجھ سکتے ہیں ؎

منصور بہ سر داد ایں نکتہ خوش سرائید
از فلسفی مپرسید امثالِ ایں مسائل

اس راہ کی ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ جو عقائد و خیالات لوگوں میں نسلاً بعد نسل چلے آتے ہیں ان کی عقیدت و محبت کچھ اس طرح قلوب و اذہان پر مسلط ہوتی ہے کہ وہ ان کے خلاف معمولی سے معمولی بات بھی سننا پسند نہیں کرتے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی دعوت قلوب و اذہان کے تزکیہ و تطہیر ہی سے کام کی ابتدا کرتی ہے۔ اور پھر دوسرے مرحلہ پر نئے عقائد و خیالات اور علوم و افکار سے اس خلا کو پر کیا جاتا ہے جسکو تعمیر فکر کہتے ہیں۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ انبیا علیہم السّلام اور ان کے متبعین کا مقصد محض جزوی انقلاب برپا کرنا نہیں ہوتا، بلکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں مکمل تبدیلی پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی تبدیلی جس میں زندگی کا نقطۂ نظر ہی بدل جائے اور انسان کا ظاہر و باطن سراسر منقلب ہو جائے، اتنا محنت طلب اور کٹھن ہے کہ عصر حاضر کا انسان اسکا تصور ہی نہیں کر سکتا اور توفیق الٰہی کے سوا اس کام کی تکمیل دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

ان عملی مشکلات کے علاوہ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی از حد ناگزیر ہے۔ جو لوگ جماعت کے بنیادی اصول و مقاصد کے اقرار و تسلیم کے بعد جماعت میں داخل ہوتے ہیں۔ انکی ذہنی، فکری اور عملی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں

کوئی فطرتِ صالحہ رکھتا ہے جو پہلے سے قبولِ حق کے لئے آمادہ ہوتی ہے۔ اور کوئی محض دیکھا دیکھی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اسکے شعور ذہن میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ ایک اعلیٰ درجہ کا ذہین ہے جو جدید فکر کو قبول کرنے کے بعد فوراً اسکے تمام تقاضوں کو سمجھنے لگتا ہے اور دوسرا اتنی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا کہ اس انقلابی فکر کو زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی کر سکے۔ اسلئے ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جماعت میں آنے کے بعد دینِ خالص اور نظمِ جماعت، کی شدید پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت نہ رکھتے ہوں اور انکی اصلاح و تربیت پر کافی وقت صرف کرنے کی ضرورت ہو۔ مگر انکی کامل تربیت سے پہلے دعوتی مہم کی راہ میں ان کو اپنے ساتھ چلانا اعلیٰ درجہ کی انتظامی بصیرت، غیر معمولی ذہانت اور ملت کی اجتماعی مصلحتوں کے فہم و ادراک کا متقاضی ہے۔

ان حقائق کے پیش نظر انقلابی مہم کی کامیابی صرف اسی شکل میں ممکن ہے کہ پہلے جماعت کی ذہنی اور عملی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے۔ اور حقیقت شناس نگاہ سے اس بات کا یقین حاصل کیا جائے کہ علم و عمل ماحول اور حالاتِ زمانہ کے پیش نظر جماعت کا موقف کیا ہے؟ اور ان مخصوص حالات میں اس سے کتنا کام لیا جا سکتا ہے؟ انبیا علیہم السّلام کی دعوت کا یہی وہ مشکل ترین مقام ہے۔ جس میں دوسرے لوگ بالعموم غلط راہ اختیار کر جاتے ہیں۔ اور جس سے ان کا کیا کرایا اکارت چلا جاتا ہے۔

نیز اس دعوت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں فوری نتائج (العاجلہ) کے مقابلہ میں دور رس نتائج یا ملت کی مصلحت کلیہ (العاقبہ) کو بہرحال ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ ایک قانون کلی ہے۔ اور اسوۂ نبوت کی روشنی میں اس سے سیکڑوں جزئیات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ انکار منکر (برائی کے خلاف اظہار نفرت) مسلمانوں کا مذہبی اور ملی فریضہ ہے۔ اور اسکی ضرورت و اہمیت کا اندازہ اُن بے شمار آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے ہو سکتا ہے جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں۔ لیکن بایں ہمہ دعوت اقامت دین کی راہ میں ایسے حالات بھی پیش آ سکتے ہیں کہ یہ فریضہ نہ صرف یہ کہ ساقط ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کا ترک ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علماء و مفکرین نے اس اصل کو جو قرآنی آیات اور اسوۂ نبوت سے ماخوذ ہے۔ باقاعدہ قانونی شکل دیدی ہے۔ علامہ ابن قیم اپنی مشہور و معروف کتاب "اعلام الموقعین" میں لکھتے ہیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلعم نے برائی کے خلاف اظہار
شرع لامتہ انکار المنکر لیحصل	نفرت کرنا امت کے لئے ضروری قرار دیا
بانکارہ من المعروف ما یحبہ	ہے تاکہ اسکے مٹانے سے معروف حاصل ہو
اللہ ورسولہ فاذا کان انکار	لیکن اگر انکار منکر سے انکر یعنی اس سے
المنکر یستلزم ما ھو انکر منہ	بھی بڑی برائی پیدا ہوتی ہو تو اس کا
والبغض الی اللہ ورسولہ فانہ	انکار ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ اس

لا يسوغ انكاره وان كان الله يبغضه ويمقت اهله وهذا كالانكار على الملوك والولاة بالخروج عليهم فانه اساس كل شر وفتنة الى اخر الدهر وقد استأذن الصحابة رسول الله صلعم في قتال الامراء الذين يوخرون الصلوة عن وقتها، و قالوا "افلا تقاتلهم" فقال "لا ما اقاموا الصلوة" وقال من رأى من اميره ما يكرهه فاليصبر ولا ينزعن يداً عن طاعته۔

ومن تامل ماجرى على الاسلام في الفتن الصغار والكبار راها من اضاعة هذا الاصل وعدم الصبر على المنكر فطلب ازالته فتولد منه ما هو اكبر منه۔

(اعلام الموقعين ج۳ ص۱۵)

منکر کو اللہ تعالیٰ بُرا سمجھتا ہے۔ اور اس منکر کے ارتکاب کرنے والوں کو سزا دیتا ہے۔ اسکی مثال جیسے کہ امراء و ملوک کے خلاف خروج کرنا ہے۔ یہ سلسلہ فتنہ و شر کی اساس ہے۔ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اُن امراء کے خلاف جنگ کرنے کی اجازت طلب کی جو نماز کو وقت سے موخر کر دیتے ہیں۔ اور کہا کہ "کیا ہم ان سے قتال نہ کریں"؟ آپ نے جواب دیا۔ "ہرگز نہیں" جب تک وہ نماز قائم کرتے رہیں اور فرمایا جو شخص اپنے امیر سے کوئی ایسی بات دیکھے جس کو وہ ناپسند کرتا ہے تو اُسے صبر کرنا چاہیئے۔ اور اطاعت سے ہاتھ نہیں کھینچنا چاہیئے۔

اسلام پر جتنے چھوٹے بڑے فتنے نازل ہوئے ہیں ان پر اگر دقتِ نظر سے غور کیا جائے تو یہ بات خود بخود ہی نظر آجائیگی کہ یہ سب کچھ اس اصل کے ضائع کرنے اور اسکی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے ہوا۔ یعنی منکر پر صبر کرنے کی بجائے اسکے ازالہ کی کوشش کی گئی اور نتیجہ کے طور پر اس سے بڑی بُرائی پیدا ہوتی چلی گئی۔

علامہ موصوف نے اسی کتاب میں انکار منکر کی چار صورتیں بیان کی ہیں۔ (۱) منکر کے مٹنے کے بعد اسکی ضد (معروف) پیدا ہو۔ (۲) منکر اگرچہ بالکلیہ نہ مٹ سکے لیکن پہلے سے کم ہو جائے (۳) اپنی طرح کی دوسری برائی اپنے پیچھے چھوڑ جائے۔ (۴) اسکے مٹنے کے بعد اس سے بڑی اور خطرناک برائی پیدا ہو جائے۔ پہلی دو صورتیں مشروع اور ضروری العمل ہیں تیسری صورت مجتہد فیہ ہے۔ اور چوتھی حرام اور واجب الترک ہے۔ مثلاً اہل معصیت کو تم دیکھتے ہو کہ وہ شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یہ کام یقیناً المنکر میں داخل ہے۔ اور اگر تم جانتے ہو کہ تمہارے انکار سے یہ لوگ شطرنج سے ہٹ کر کسی مفید اور نیک کام میں لگ جائینگے تو اس صورت میں ایسا کرنا ضروری ہے۔ لیکن آپ قرائن و آثار سے یہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ شطرنج کو چھوڑ کر ایذا رسانی، غصب اموال اور اس قسم کے شنیع اعمال کا ارتکاب کرینگے تو مصلحت کا اقتضا یہ ہے کہ ان کو اسی حال میں رہنے دیا جائے۔

امام ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ہم تاتاریوں کے زمانہ میں کچھ لوگوں کے پاس سے گذرے جو شراب پی رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے ان پر انکار کیا میں نے ان ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالٰے نے شراب سے اسلئے منع کیا ہے کہ وہ اللہ کے ذکر اور نماز سے باز رکھتی ہے۔ مگر ان لوگوں کو قتل نفوس غصب اموال اور مخلوق خدا کو قیدی بنانے سے روکتی ہے۔ اسلئے بہتر یہ ہے کہ ان کو اسی حال میں رہنے دیا جائے[1]۔

---

[1] اعلام الموقعین ۱۲

حاصل یہ ہے کہ عقل و شرع کے نزدیک ہمیشہ سے یہ حقیقتیں مسلّم چلی آتی ہیں کہ دو برائیوں میں سے کمتر برائی (اھون البلیتین) کو اختیار کر لیا جائے۔ کسی بہت بڑے مقصد کے حصول کے لئے کچھ نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے۔ شخصی اور گروہی مفادات کو دینی اور ملی مفاد کے لئے قربان کر دینا چاہئے کہ اس سے پائدار اور مستقل نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ عام جماعتی اور دینی مقاصد کے لئے کچھ لوگوں سے نرمی اور رعایت کا سلوک کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ مصلحت کلیّہ کی خاطر بعض دفعہ کچھ فرائض بھی نظر انداز کئے جا سکتے ہیں۔

مگر اس مقام پر اس بات کو ہرگز بھولنا نہیں چاہئے کہ ایسے حالات کی تعیین و تشخیص کے لئے اعلیٰ درجہ کی دینی بصیرت، بے نظیر فہم و ذکاء اور غیر معمولی ذہانت و فرزانگی کی ضرورت ہے۔ ہر شخص کا یہ کام نہیں ہے، کہ وہ حالات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لے کر صحیح اور مناسب فیصلہ کرے۔ یا احکام و فرائض کی حقیقی قدروں کو سمجھ کر ہر چیز کو اسکی مناسب جگہ پر رکھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر ہر شخص کو اسکی اجازت دیدی جائے تو اسلام کا نظام اجتماعی درہم برہم ہو جائے۔ اور اسلامی قانون اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہے۔

بہرحال اسوۂ نبوت کی روشنی میں ایک مستقل فلسفۂ دعوت مرتب کیا جا سکتا ہے۔ جس سے ہم دعوتِ اقامتِ دین میں رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔ مگر اسکے لئے کتاب اللہ اور منہاج نبوت کا عمیق مطالعہ کرنا چاہئے۔

ہم اسکے کچھ نظائر ذیل میں درج کرتے ہیں۔

عہد نبوت میں غزوۂ اُحد اور غزوہ حنین میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد میدان جنگ سے بھاگ نکلی تھی۔ یہ ایک اخلاقی مذہبی اور ملی گناہ ہے۔ قرآن حکیم نے ایسے اشخاص کے لئے " بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ" کے پُر ہیبت الفاظ استعمال کئے ہیں۔ نیز یہ ایک اجماعتی جرم تھا۔ اور امیر ملت کو یہ حق پہنچتا تھا کہ ان لوگوں کو شدید سزا دے۔ مگر آنحضرت صلعم نے ایسا نہیں کیا بلکہ ان لوگوں کو معاف کر دیا۔ اور خداوند تعالےٰ نے آپ کے اس طرز عمل کی تعریف فرمائی۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (آل عمران)

آپ نے اللہ ہی کی رحمت سے ان لوگوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا۔ اگر آپ سخت خو اور سخت دل ہوتے تو یہ لوگ آپ سے دور بھاگ جاتے۔

محاذ جنگ پر حدود اللہ کے عدم نفاذ کی مصلحت بھی یہی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا مقصد نگاہ کے سامنے ہوتا ہے۔ اور اسکی خاطر بہت سے امور کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نہی ان تقطع الایدی فی الغزو۔ (رواہ ابوداؤد)

آنحضرت صلعم نے جہاد کے موقع پر ہاتھ کاٹنے سے منع فرمایا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس موقع پر جن ہاتھوں سے کفر و معصیت اور فتنہ و فساد کے مٹانے کا کام لیا جا سکتا ہے انکو چوری کی سزا میں کاٹ دینا

کسی طرح قرینِ مصلحت نہیں ہے۔

مصلحت عامہ کو ملحوظ رکھنے کی ایک مثال یہ ہے کہ جو لوگ نئے نئے جماعت میں شامل ہوں، اور وہ فکر و عمل کے اعتبار سے ابھی ناپختہ ہوں ان پر اگر دفعتہً تمام دینی احکام و فرائض اور شدید جماعتی ڈسپلن کا بار گراں ڈال دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اسکی تاب نہ لا سکیں اور دین سے برگشتہ خاطر ہو جائیں۔ اس معاملہ میں اسوۂ نبوت یہ ہے کہ ان لوگوں کو تدریجی طور پر ان پابندیوں کا خوگر بنایا جائے۔ اصول حکمت کے تحت انکی صحیح تربیت کی جائے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ خود بخود ہی تمام دینی پابندیوں کو بخوشی قبول کر لیں۔

اسی طرح بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک کام کے فوری نتائج نہایت دل فریب اور پرکشش ہوتے ہیں۔ لیکن ان فوری نتائج کے مقابلہ میں دیرپا اور شاندار نتائج و ثمرات کی توقع ہوتی ہے۔ اور ان کی خاطر فوری اور عارضی نتائج کو پس انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسکی مثال یوں سمجھئے کہ ایک نیا ملک فوجی طاقت سے فتح کیا جاتا ہے اور اس ملک کے جملہ وسائل پیداوار فاتحین کے زیر اقتدار آجاتے ہیں۔ اس موقع پر العاجلہ کا اقتضا یہ ہے کہ ان وسائل پیداوار سے جی بھر کر فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس ملک کے باشندوں کے قومی اور ملی تقاضوں سے بے اعتنائی کی جائے، اور کامل تسلّط کے بعد ان پر گراں بار ٹیکس عائد کئے جائیں۔ اور لوٹ گھسوٹ سے اپنے لئے عیش و نشاط کا سامان مہیا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طریق کار سے کچھ دیر

کے لئے فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکے گا اور ملت کی مصلحت عامہ کا اقتضایہ ہے کہ مفتوحین کو ہر طرح کی آزادی عمل اور حریتِ فکر عطا کی جائے۔ ان کے وسائل پیداوار کو انہیں کے قبضہ میں رہنے دیا جائے۔ ان کے اجتماعی اور مذہبی احساسات کا احترام کیا جائے۔ اور ان کو جدید حکومت کے تحت ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ ہمارے انفس واموال ہماری تہذیب اور کلچر، ہماری مذہبی روایات اسی حکومت کے زیر اثر محفوظ رہ سکتی ہیں۔ اس فراخدلانہ طرز عمل سے سیاسی طور پر یہ فائدہ ہوگا کہ یہ لوگ ہمیشہ کے لئے اس حکومت کے وفادار رہیں گے۔ اور دینی لحاظ سے یہ فائدہ ہوگا کہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور انکی اجتماعی اور شخصی سیرت کے مشاہدہ وتجربہ سے وہ لوگ بہ تدریج دینی اثر قبول کرتے جائینگے۔

نیز اقامتِ دین کی جدوجہد میں حصّہ لینے والوں کے لئے زمانہ کے مخصوص حالات، ماحول اور مملکت کے برسر اقتدار طبقہ اور عوام کے نفسیات اور ذہنی صلاحیتوں کا عمیق مطالعہ بھی ازحد ناگزیر ہے کیونکہ یہ لوگ دعوتِ حق کے براہ راست مخاطب ہیں۔ اور داعی حق جماعت کی معمولی سی لغزش مقصد کو شدید نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اگر ملک کی زمام اقتدار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں ہو تو اسوقت دعوت کے طرز وطریق کیا ہوں۔ اور اگر مسند اقتدار پر خود مسلمانوں کا غلط کار

اور معصیت کوش طبقہ قابض ہو تو اس حالت میں دعوتِ اقامتِ دین کا رنگ کیا ہو؟ یہ تمام مسائل ایسے ہیں جو پیغمبرانہ دعوت انقلاب کے اہم اور ناقابل فراموش پہلو ہیں۔ اور ان کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے

السمع والطاعۃ یوں تو ہر قومی اور اجتماعی تنظیم میں سمع وطاعت کی اہمیت وضرورت کا احساس پایا جاتا ہے اور اسکے سوا کوئی انسانی جماعت اپنے اجتماعی مقاصد میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ لیکن حضراتِ انبیاء علیہم السّلام کی جماعت میں سمع وطاعت کو ایک مقدس مذہبی اور اخلاقی فریضہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں سمع وطاعت جماعت کی ملی سیرت کا ایک مستقل باب ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکو خالص مذہبی فریضہ قرار دیا ہے۔

قال رسول اللہ صلعم وانا امرکم بخمسٍ اللہ امرنی بھن الجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد فی سبیل اللہ فانہ من خرج من الجماعۃ قید شبر فقد خلع ربقۃ الاسلام عن عنقہ الا ان یراجع۔ (رواہ احمد)	فرمایا کہ میں تم کو پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ التزام جماعت، سمع وطاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ کیونکہ جو شخص ایک بالشت بھی جماعت سے نکل گیا گویا اس نے اسلام کی رسی اپنی گردن سے اتار پھینکی۔ مگر اس صورت میں جبکہ وہ پھر جماعت میں آجائے۔
قال عبادۃ بن الصامتؓ	عبادہ بن صامت کہتے ہیں کہ آنحضرت صلعم

دعانا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فبایعنا فقال فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا ومکرھنا وعسرنا ویسرنا واثرۃ علینا وان لا ننازع الامر اھلہ الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان۔

(بخاری کتاب الفتن)

نے ہمکو بلایا اور ہم سے بیعت لی۔ ہم سے جو عہد لیا وہ یہ ہے کہ ہم ہر حال میں سمع وطاعت کے پابند رہیں۔ خواہ آرام و خوشی کا وقت ہو یا رنج و مصیبت کا یا ہم سے ترجیحی سلوک کیا جا رہا ہو۔ نیز اس بات کا ہم نے عہد لیا کہ حکومت کے معاملہ میں اہل حکومت سے نزاع نہ کرینگے۔ ہاں اسوقت ایسا کر سکتے ہو جبکہ تم ایسا واضح کفر دیکھو جسکے لئے تمہارے پاس خدائی سند موجود ہو۔

اصل میں دین (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) ہے ہی ایک مکمل نظام اطاعت! لیکن یہ اطاعت عملی طور پر دو طریق سے متشکل ہوتی ہے۔ ایک بلا واسطہ اور دوسری بالواسطہ۔ نبی اور امیر کی اطاعت دوسری قسم میں شامل ہے۔ قرآن حکیم نے اطاعت کی یہ دونوں قسمیں بیان کی ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔ (النساء)

اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور تم میں سے جو امیر ہیں انکی اطاعت کرو۔

اس موقع پر قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کو فعل کے تکرار سے اور اولی الامر کی اطاعت کو بلا تکرار فعل ذکر کیا گیا ہے جس سے

ہم بآسانی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت میں قدر مشترک ایک ہی ہے کہ یہ دونوں اطاعتیں مقصود بالذات نہیں ہیں مقصود بالذات صرف اول الذکر اطاعت (اطیعوا اللّٰہ) ہی ہے۔ اور یہ دو اطاعتیں بالترتیب درمیانی واسطہ ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ رسول کو امارت و امامت کی حیثیت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت سے بھی اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ رسول کی امامت و امارت براہِ راست خدا سے حاصل ہوتی ہے اور رسول کے احکام میں غلطی کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اسلئے کہ وہ معصوم اور ملہم من اللہ ہوتے ہیں۔ اور دوسرے امراء (خلفاء) رسول ہی کی عملی سیرت کی اقتدا کرنے کی وجہ سے اطاعت کے اہل تصور کئے جا سکتے ہیں۔ اسوجہ سے اطاعت رسول اور اطاعت اولی الامر میں بہت بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کی طرح مقصود بالذات مان لیا جائے کہ یہ اسلام کی نظر میں شرک ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ۔

نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو کتاب، حکومت اور نبوت عطا کرے۔ اور پھر وہ لوگوں سے یوں کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (بلکہ وہ تو یوں کہتے ہیں) کہ تم اللہ والے بن جاؤ، اسلئے کہ تم کتاب اللہ کو پڑھاتے اور پڑھتے ہو۔

بلکہ رسول کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی اطاعت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اور خود بھی اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (آیہ)

پھر ہم نے آپ کو دین کی ایک شریعت پر مبعوث کیا۔ پس آپ اس شریعت کی پیروی کریں۔ اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کریں جو کچھ بھی سمجھ نہیں رکھتے۔

اور جہاں نبی یہ کہتا ہے کہ میری اطاعت کرو" اطیعون" تو اسکا مطلب صرف اتنا ہے کہ میں رسول کی حیثیت سے تم سے جو مطالبہ کرتا ہوں اُسکو تسلیم کر لو اور جس طرف میں تم کو لے جانا چاہتا ہوں تم میرے پیچھے اس طرف کو چل پڑو۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ دوسری قومیں چونکہ زندگی کا کوئی پاکیزہ نصب العین نہیں رکھتیں۔ اور نہ ہی خیر و شر اور نیک و بد کے امتیاز کے لئے ان کے پاس کوئی اخلاقی دستور العمل ہے۔ اسلئے ان کے یہاں اطاعت کا مفہوم ہی متعین نہیں ہے۔ اور نہ ہی اسکی حدیں مقرر ہیں مگر انبیا علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی سیرت واخلاق کی اصلاح کریں۔ اور انسانی جماعت کو ذمائم اخلاق سے بچا کر منزل مقصود کی طرف لے جائیں اسلئے وہ ایک متعین اور مرتب نظام اخلاق اپنے پاس رکھتے ہیں۔ اور اس نظام کے تحت اپنے پیرؤں سے سمع وطاعت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اسلام میں یہ بات مانی ہوئی ہے کہ معصیت کے

کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اور پھر اسلام نے خیر و شر کی اخلاقی قدریں بھی متعین کر دی ہیں۔

عن النبی صلعم قال السمع والطاعة علی المرء المسلم فیما احب وکرہ ما لم یؤمر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة۔	سمع و طاعت مسلمان پر لازم ہے۔ ان تمام باتوں میں جن کو وہ پسند کرے، یا ناپسند کرے۔ جبتک کہ اسکو اللہ کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا (سمع) جائز ہے اور نہ ماننا (طاعت) جائز ہے۔
(بخاری)	

شعبہ ہائے زندگی کی تنظیم و ترتیب

جو قومیں علوم نبوت سے بے بہرہ ہوتی ہیں، ان میں حیات انسانی کے مختلف اجزاء کی تنظیم اور شعبہ ہائے زندگی کے توازن کو برقرار رکھنے کی خواہش بالکل مفقود ہوتی ہے۔ زمانہ کی ٹھوکر جس جانب کو ان کا رُخ پھیر دے وہ اسی طرف کو پھر جاتی ہیں۔ خواہ دوسری طرف زندگی کی حسین تمنائیں پامال ہوتی ہوں۔ چنانچہ آج اقوام حاضرہ کا رجحان فکر ہمارے سامنے ہے۔ زندگی کی بے شمار خواہشیں ہیں۔ جو ان کی طرف حسرت و یاس کی نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔ مگر یہ قومیں ہیں کہ مسئلہ معیشت کے سوا ان کو کسی دوسری چیز سے سروکار ہی نہیں ہے۔ یہ اس زعم باطل میں مبتلا ہیں کہ زندگی کا حقیقی مسئلہ فقط معیشت ہی کا مسئلہ ہے۔ اور جس دن یہ حل ہو جائیگا زندگی کے تمام دوسرے مسائل خود بخود ہی حل ہو جائینگے۔ مگر یہ کتنی بڑی ضلالت

ہے کہ اس سے بڑی ضلالت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

در اصل یہ ضلالت آج کی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ امم سابقہ جن کا قرآن حکیم نے بار بار ذکر کیا ہے، اسی گمراہی میں مبتلا رہی ہیں۔ اور ان کی ہلاکت وبربادی کا حقیقی سبب ہی یہ گمراہی تھی کہ وسائل معیشت کی طلب وجستجو اور اسباب زینت وتجمل کی ہوس نے ان کو راہِ اعتدال سے پھیر دیا تھا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ۔ (القصص)

کتنی قوموں کو ہم نے ہلاک کیا، جو اپنی معیشت میں حد اعتدال سے بڑھ گئی تھیں۔ پس یہ ہیں انکے مکانات جو انکے بعد بہت ہی کم آباد ہوئے ہیں۔ اور حقیقی وارث تو ہم ہی ہیں۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اجزاء حیات کی بدنظمی اور بے ترتیبی ہی کا دوسرا نام فساد اور ظلم ہے۔ اور اس کا طبعی نتیجہ ہلاکت وبربادی کی صورت میں متشکل ہوتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ۔ (ہود)

اور ایسی ہی ہے تیرے رب کی پکڑ جبکہ وہ قوموں کو انکے ظلم کی وجہ سے پکڑتا ہے، بے شک تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہے۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ۔ (ہود)

آپ کے رب کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ ظلم سے بستیوں کو برباد کر دے حالانکہ ان بستیوں کے رہنے والے اصلاح طلب لگے ہوں۔

اسکے برعکس انبیا علیہم السّلام پہلی ہی نظر میں معاشرۂ انسانی کے تمام داخلی اور خارجی شعبوں پر متجسسانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔ اور پھر اسکی علمی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی اور عمرانی خرابیوں کی اصلاح کی جدوجہد کرتے ہیں۔ جہاں ان کو بدنظمی اور بے ترتیبی نظر آتی ہے اسکو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر سب سے پہلے وہ فکر و ذہن کی کج ادائیوں سے تعرض کرتے ہیں۔ غلط عقائد و خیالات اور شکوک و شبہات کے کانٹوں سے قلوب و اذہان کی زمین کو پاک کر کے ان میں صحیح علوم و افکار کی آبیاری کرتے ہیں۔ اور اسکے بعد اسکے خارجی مظاہر تمدن میں جہاں جہاں ان کو مفاسد نظر آتے ہیں، اُن کو چُن چُن کر سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً حضرت لوط علیہ السّلام کی قوم میں ایک نہایت ہی اخلاق سوز اور خلاف فطرت فعل کا عام رواج تھا۔ اور حضرت لوط علیہ السّلام ان کو اخلاصِ عبادت، توحید اور طاعۃ اللہ کی دعوت کے بعد بار بار اس عمل سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔ اور ان کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ فعل فطرت اللہ کے خلاف ہے۔ اور تم نے پہلی دفعہ اس کو دنیا میں رواج دیا ہے۔

اِذْ قَالَ لِقَوْمِہٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمْ بِھَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِیْنَ۔ اِنَّکُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَھْوَۃً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔ (اعراف)	جب حضرت لوط نے اپنی قوم سے کہا کیا تم اس شرمناک فعل کا ارتکاب کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی شہوانی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت میں تم حد سے بڑھنے والی قوم ہو۔

مگر جس قوم میں اس قسم کی اخلاقی بیماریاں جڑ پکڑ چکی ہوں، اور اسکے مزاج میں خبث و ناپاکی پختہ و راسخ ہو چکی ہو، وہ اس طرح کی طہارت و پاکیزگی کو کب پسند کرتی ہے؟ چنانچہ یہی قوم حضرت لوط کے جواب میں یوں کہتی ہے۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهِ إِلَّا أَنْ قَالُوا أَخْرِجُوهُمْ مِنْ قَرْيَتِكُمْ إِنَّهُمْ أُنَاسٌ يَتَطَهَّرُونَ ۔

اسکی قوم کا یہ ایک ہی جواب تھا کہ ان لوگوں کو اپنی بستی سے نکال دو۔ کیونکہ یہ لوگ طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔

"انہم اناس یتطہرون" کے الفاظ قابل غور ہیں۔ یعنی اس قوم کے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام کا گناہ یہی ہے کہ وہ طہارت و پاکیزگی کو پسند کرتے ہیں۔ اور یہی وہ جرم ہے جسکی وجہ سے ان کو جلا وطنی کی دھمکی دی جارہی ہے[۱]

حضرت شعیبؑ کی قوم میں دوسرے مفاسد اجتماعیہ بھی موجود تھے۔ مگر اسکے طرز تمدن و معیشت میں ایک نمایاں خرابی یہ تھی کہ وہ ناپ اور تول میں کمی بیشی کرتے تھے۔ اور شعیب علیہ السلام جہاں ان کو اصلاح فکر کی دعوت دیتے ہیں، وہاں تمدن کے اس ابھرے ہوئے ناسور کی بار بار نشان دہی کرتے ہیں۔

بالکل یہی حال تمام انبیا علیہم السلام کا ہے کہ وہ اپنے مخصوص اسلوب

---

[۱] آج ہمارے معاشرہ کی حالت بھی قریب قریب یہی ہے یہاں کے بااقتدار لوگوں اور اہل ثروت کی نظر میں وہ لوگ گردن زدنی ہیں جو ان کی فحش کاریوں بدیانتیوں اور ستم کاریوں کی مذمت کرتے ہیں۔

دعوت سے اولاً معاشرہ کے بنیادی اور نمایاں مفاسد کی اصلاح پر زور دیتے ہیں۔ اور جو لوگ ان کے فلسفۂ زندگی کے اصول و مبادی کو تسلیم کر کے جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں، ان کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ صلاح دعوے کا خوگر بنایا جاتا ہے۔ ان کے فکر و عمل کے نشیب و فراز کو حکیمانہ انداز میں متوازن اور ہموار کیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اس انقلابی جماعت کی زندگی صحیح طور پر منظم اور معتدل بن جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے انبیاء علیہم السلام کے الہامی دستور اصلاح و تعمیر کو "المیزان" کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے۔

دراصل حیات انسانی کے متفاوت اجزا میں ربط و ترتیب قانون فطرت ہی کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قانون فطرت دو حصوں میں منقسم ہے ایک حصہ وہ ہے جس کا تعلق پوری کائنات سے ہے۔ یعنی کائنات کا نظم و نسق اسی کے ذریعہ قائم ہے۔ اس عالمی اور کائناتی قانون میں۔ رد و بدل کرنا انسانی حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔ قرآن حکیم نے اس غیر متبدل اور غیر اختیاری قانون کو بھی "المیزان" سے تعبیر کیا ہے۔

السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ
اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ [1]

دوسرا حصہ اختیاری ہے۔ اس میں رد و بدل کرنے یا اسکی خلاف ورزی

---

[1] اس آیت میں المیزان کا اطلاق عام معنی میں کیا ہوا ہے جو دونوں کو شامل ہے۔ لہٰذا بعد کے فقرہ "واقیموا الوزن بالقسط" کے معنی متعین کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔

کرنے پر انسان قدرت رکھتا ہے۔ یہی وہ قانون ہے جس کے توسط سے حضرات انبیا علیہم السّلام غیر متوازن معاشرہ انسانی میں توازن قائم کرتے ہیں۔ اور قرآن کریم اسکو "المیزان" کا نام دیتا ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (الحدید)

ہم نے اپنے رسول آیات بینات کے ساتھ بھیجے۔ اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ نقطۂ عدل پر کھڑے ہوجائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ اَنْزَلَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ۔ (الشوریٰ)

اللہ وہ ذات ہے جس نے کتاب اور میزان اتاری۔

دینی نظام سیاست و اجتماع کی عملی تشکیل

انسانی سوسائٹی میں کامل اور جامع انقلاب بپا کرنے میں بہت سے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً تطہیر و تعمیر فکر، تربیت فکر و عمل اور جماعت کے مختلف شعبہ ہائے زندگی کی تنقیح و ترتیب، جماعتی تنظیم کی وہ کٹھن اور دشوار گذار منزلیں ہیں جنکو عبور کئے بغیر منزل مقصود کی ایک جھلک بھی میسر نہیں آسکتی۔ اور اس دشتِ بلا کی راہ نوردی ہمیشہ ان لوگوں کے حصے میں آئی ہے جو مرد خود آگاہ و حق شناس اور دردِ عشق سے آشنا ہوتے ہیں۔ جنکی نگاہِ انقلاب آفریں سے دلوں کی دنیا ہی پلٹ جاتی ہے جنکی صحبت ہر خام کو پختہ تر بنا دیتی ہے۔ اور جنکی قوت کردار نسانے کے دھارے کو نئی سمت کی طرف پھیر دیتی ہے۔

پختہ سازد صحبتش ہر خام را　　تازہ غوغائے دہد ایام را
صحبتِ او ہر خزف را دُر کند　　حکمتِ او ہر تہی را پُر کند

جب انسانیت اہلِ زمانہ کی ستم آرائیوں اور ہوس پرستیوں سے چلا اٹھتی ہے۔ حق و صداقت، اور شرافت و دیانت کو کسی گوشۂ زمین میں پناہ نہیں ملتی۔ خدا کے بندوں کے لئے کائنات کی وسعتیں تنگ ہو جاتی ہیں اور ان کے لئے دنیا میں کوئی سہارا باقی نہیں رہتا۔ ایسے وقت میں کوئی مرد خود آگاہ اٹھتا ہے، جو زندگی کو نئے ولولوں اور نئی امنگوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ ؎

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

حضرات انبیا علیہم السّلام اور اصحابِ دعوتِ تجدید دین کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انسانوں کے اذہان و افکار میں نئی تبدیلی پیدا کرنا نہایت مشکل اور محنت طلب کام ہے۔ اس میں ہمیشہ حوصلہ شکن خطرات و مہالک اور صبر آزما مصائب و شدائد سے دوچار ہونا پڑتا ہے مگر جو لوگ دُھن کے پکے اور صدق و اخلاص کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ہیں، وہ ان روح فرسا اور جگر خراش حالات میں بھی زندگی کے آخری لمحہ تک ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور ان کا ہر قدم آگے کی طرف ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاشرہ کی حیات اجتماعیہ میں مکمل صالح انقلاب بپا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی شبانہ روز کی

انتھک محنت اور سرفروشانہ جدوجہد یونہی رائگاں چلی جائے اور اس سے عالمِ انسانی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے۔

قرآن حکیم نے جن انبیاء و رسل کے حالات بیان کئے ہیں، ان میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے انبیا کی ہے جو آخر دم تک اصلاح و تعمیر اور تنظیم جماعت کی مہم میں منہمک رہے۔ طعنے سُنے۔ گالیاں کھائیں۔ اذیتیں اُٹھائیں اور اس راہ میں اتنے شدائد و آلام برداشت کیے کہ ان کے تصور ہی سے سینہ شق ہونے لگتا ہے۔ ؎

اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

مگر اس شبانہ روز کی محنت و کاوش کے باوجود قوم کے صرف چند افراد نے ان کی دعوت کو قبول کیا۔ اور پوری قوم ضد اور انکار پر اڑی رہی۔ مگر کیا یہ مانا جا سکتا ہے کہ ان کی صدائے حق صرف چند کانوں تک پہنچ کر فنا ہو گئی۔ اور اپنے پیچھے کوئی مستقل اور پائدار اثر نہیں چھوڑ گئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ ان انبیا نے اپنے اپنے زمانہ میں جیسا اور جتنا کام کیا اس وقت کے لحاظ سے ایسا اور اتنا ہی کام ہو سکتا تھا۔ اور ہر نبی کی جدوجہد انسانیت مطلقہ کے لئے مستقل اور کار آمد ورثہ چھوڑ گئی ہے۔ مگر تاریخ کے ان ادوار میں انسان کا شعورِ ذات چونکہ لکل نا تمام اور نا پختہ تھا۔ اسلئے انسانی حیات اجتماعیہ میں کامل انقلاب رونما نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی دینی نظامِ سیاست و اجتماع کی عملی تشکیل

ہو سکی۔ ہاں انبیاء بنی اسرائیل نے دعوتِ جہاد و اقامتِ دین کے ذریعہ دنیا کے ایک حصہ میں خلافت الٰہیہ قائم کی۔ لیکن انسانیت کا یہ دور بھی حیثیتِ ارتقا کے لحاظ سے اس منزل تک نہیں پہنچ سکتا تھا کہ ایک جامع، اور مکمل نظامِ حیاتِ ان کے حوالے کیا جاتا جو آنے والی انسانی نسلوں کے لئے درخشندہ مثال بنتا۔

دراصل قدرت کا منشا یہ تھا کہ یہ کام دنیا کی سب سے بڑی شخصیت اور سب سے آخری رہنمائے انسانیت کے ہاتھوں تکمیل پذیر ہو۔ چنانچہ جناب ختم المرتبت والرسالتہ حضرت محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں سے اس مکمل اور ہمہ گیر نظامِ اجتماع وسیاست کی تکمیل ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی میں اسکو عملاً نافذ کیا۔ اور آپ کے بعد خلفائے راشدین نے اس کو بالکل منہاج نبوت پر چلایا۔ یہ مقدس نظامِ حیات اگرچہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں اس کی عطر بیزیوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ مہک اُٹھا اور عالم انسانی کی دیرینہ تمنائیں یکجا امن و راحت بن کر مشہود شکل میں جلوہ گر ہوئیں۔ اور آج بھی بلا خوف تردید اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ انسانیت کا یہی وہ دورِ رحمت ہے، جو نسل انسانی کے لئے ایک معیاری (آئیڈیل) حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہی وہ درخشندہ مثال ہے جس کو سامنے رکھکر عصر حاضر کا انسان اپنا سفر حیات جاری رکھ سکتا ہے۔

ان ھو الا ذکر للعالمین - ولتعلمن نبأہ بعد حین
اس موقع پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ نظامِ اسلامی اگر فی الواقع نسلِ انسانی کے لئے سراپا رحمت تھا تو زیادہ دیر تک کیوں نہ قائم رہ سکا - مگر یہاں اس مسئلہ سے متعلق تفصیلی بحث میں پڑنے کی گنجائش نہیں ہے - البتہ مختصراً اتنا عرض کرنا ضروری ہے کہ کسی نظامِ زندگی کے حسن و قبح کی پہچان کیسے ہو سکتی ہے - اور کس معیار پر اسکو پرکھا جا سکتا ہے؟

در اصل کسی نظامِ زندگی کا حسن معلوم کرنے میں جن امور کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہیں - کہ

(۱) اس نظام کے طبعی تقاضے کیا ہیں؟ کیا اس کے ذریعہ ایک پرامن، خوش حال اور متوازن معاشرۂ انسانی کی تشکیل ہو سکتی ہے؟

(۲) نیز یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ کیا عملی زندگی میں اسکا نفاذ و اجراء ممکن ہے؟

(۳) اگر کسی خطۂ ارضی میں اس کا نفاذ ہوا ہے تو اس سے عالمِ انسانی کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟

یہ ہیں وہ سوالات جو کسی نظامِ حیات کے حسن و افادہ کی نسبت اٹھائے جا سکتے ہیں - اور ان سوالات کی روشنی میں اگر آپ اسلامی نظامِ اجتماع کا جائزہ لیں گے تو یقیناً آپ اس نتیجہ پر

پہنچیں گے کہ

(۱) نظام اسلامی کی طبیعت اور فطرت ایک پاکیزہ پُر امن، اور متوازن معاشرۂ انسانی کی مقتضی ہے۔

(ب) اور چونکہ یہ نظام ایک عرصہ تک عملاً نافذ رہ چکا ہے اسلئے اسکے متعلق یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ یہ افلاطون کی "تصوری ریاست" کی طرح ناقابلِ عمل ہے۔

(ج) اور جہاں تک زمانۂ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ کے ثمرات و نتائج کا تعلق ہے۔ اسلام کا کوئی بدترین دشمن بھی اس بات کا منکر نہیں ہے کہ تاریخ انسانی کا یہ دور سب سے زیادہ پُر امن اور سب سے زیادہ خوشحال تھا۔

رہا یہ سوال کہ انسان کی ہوسناکیوں نے اس مقدّس نظام کو دیر تک کیوں نہ چلنے دیا؟ تو یہ سوال کسی نظامِ زندگی کے حُسنِ ذاتی اور حقیقی افادہ کے سلسلہ میں ہرگز نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ بلکہ درحقیقت یہ بالکل الگ سوال ہے۔ جو انسان کے ذہنی اور نفسیاتی عوامل سے متعلق ہے۔

بہرحال یہ مکمل اور صالح انقلاب امتِ مسلمہ کی سرفروشانہ جدوجہد سے پہلی مرتبہ ریگستانِ عرب میں رونما ہوا۔ جسکی نورانی شعاعوں نے مشرق و مغرب کو منور کیا۔ اور اس انقلاب کے بعد ہی دنیا جمہوریت و مساوات اور حریت و آزادی کے نام سے

آشنا ہوئی ۔ مگر دنیائے انسانیت کی شومی قسمت کا ماتم کرنا چاہیئے کہ خود "امتِ عربیہ" کے ہاتھوں انسانیت کی یہ مقدس امانت پیوندِ خاک ہو کر رہ گئی ۔ ؎

آنچہ تو با خویش کردی کس نہ کرد
روحِ پاکِ مصطفےٰ آمد بدرد

آج نظامِ اسلامی کی عملی تشکیل کیسے ہو سکتی ہے؟

زوالِ اُمت کے ابتدائی دور سے زمانہ حاضر تک ملت کے اجتماعی نظام میں جس قدر مفاسد رونما ہوئے ہیں۔ اگر ہم انکی عددی کثرت کو ایک جامع اور کلی مفہوم کے اندر سمیٹنا چاہیں تو وہ مفہوم یقیناً یہی ہو سکتا ہے "مسلمانوں کا فکری اور عملی انتشار"۔ بلاشبہ اسبابِ فساد ہر دور کے الگ الگ ہیں۔ اور اُن کے اثرات بھی بظاہر جدا جدا ہیں۔ لیکن ان تمام اثرات کا حاصل یہی مفہوم کلی ہے۔ چنانچہ نسلی اور قبیلوی عصبیت کا پہلا اثر یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے اجتماعی اور ملی فکر و عمل میں اختلال پیدا کیا۔ ملوکیت کا پہلا حملہ مسلمانوں کی وحدت فکر و عمل پر ہی ہوا۔ اعتقادی تعصب اور سیاسی تحزب کا اولین نتیجہ بھی اسکے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور مسلمانوں کے دل و دماغ پر غیر اسلامی علوم و افکار کا تسلّط ان کی وحدت فکر و عمل کے لئے زہریلا پن سے کم نہیں ہے۔

اس سے انکار نہیں ... کہ یہ مرض بہت دیرینہ ہے اور اسلامی تاریخ کے ہر دور میں اصحاب دعوت و تجدید اس مرض کی تدبیر و اصلاح کی لگاتار

کوشش وسعی کرتے رہے ہیں۔ اور گاہے گاہے وہ جزوی طور پر اس میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ مگر اس مرض کے اسباب جنکی عمومی تعبیر ذہواء و شہوات کی قرآنی اصطلاح ہی سے ہو سکتی ہے۔ کچھ ایسے ضدی اور سخت جان واقع ہوئے ہیں کہ وہ ہر دفعہ کی شکست و ہزیمت کے بعد از سر نو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں۔ اس میں وہ عین دور شباب میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سبب مرض جس قدر قوی اور طاقتور ہوتا ہے، مرض بھی اسی تناسب سے شدید اور مہلک ہوتا ہے۔ جو مریض کو خطرناک عوارض سے دوچار کرتا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کا مسلمان نہایت شدید طور پر اس مہلک مرض (فکری تضاد اور عملی انتشار) میں مبتلا ہے۔ اور آج اگر کوئی شخصیت یا جماعت ملت کے اس مرض (جو اسکے جسم کے ایک ایک ریشے میں اثر کر چکا ہے) کے علاج کے لئے اُٹھے گی۔ تو اس کو دور ماضی کے ائمۂ دعوت وارشاد سے کہیں زیادہ عزم و ثبات اور صبر و استقلال سے کام کرنا پڑے گا۔ مگر شدتِ مرض کو دیکھ کر یاس و نومیدی کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر معالج کی نگاہ دور رس ہوگی اور وہ مریض کے مخصوص مزاج کی تشخیص، سوء مزاج کے ارتقائی مراحل کی تعیین، اصل مرض اور عوارض مرض کے امتیاز کے بعد تدبیر و علاج کے طرز و طریق اور نسخہ کی تجویز میں غلطی کا ارتکاب نہ کرے گا۔ تو اب بھی مریض کا صحت یاب ہو جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ آج تدبیر و اصلاح اور

تجویز دوا کے بجائے مرض کا علاج دوسرے مرض سے کیا جا رہا ہے۔ اور اس عجیب و غریب طریق علاج کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

آج ہمارے سامنے اُمت کی تعمیر جدید کا مشکل ترین مسئلہ درپیش ہے جسکو حل کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک طریقہ وہ ہے جس پر آج دنیا کی دوسری قومیں عمل کر رہی ہیں۔ یعنی تعمیر انسانیت کا مادی طریق کار۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جس پر ابتدائے آفرینش سے انبیاء و رسل، اور انکے ماننے والے عمل پیرا رہے ہیں۔ یعنی اخلاقی بنیادوں پر انسانیت کی تعمیر۔ اب ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان دونوں طریقوں کے نظری، علمی اور عملی مواقف کا تجزیہ کریں۔ اور ان کے نفع و ضرر پر تحقیقی نگاہ ڈالیں اور انتہائی حزم و احتیاط اور اجتہاد و بصیرت سے ان مختلف راہوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کریں۔

یہ دو طریقے دو الگ الگ نظریہ ہائے زندگی پر مبنی ہیں۔ پہلے طریقہ کی اساس خالص مادی تصور زندگی پر ہے۔ اور دوسرا طریقہ اخلاقی اور مابعد الطبیعی تصور حیات پر مبنی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم ان دو طریقوں میں سے کون سا طریقہ اختیار کریں۔ اول الذکر طریقہ سے ہم ایک معتدل اور متوازن معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ یا ثانی الذکر طریقہ سے۔ یا ان دونوں کے خاص خاص اجزا کی ترکیب سے ایک نئے اور مخلوط لائحہ عمل مرتب کرنے سے؟ مگر اس فکری کاوش

سے پہلے اور ان دو طریقوں کی افادیت وعدم افادیت سے قطع نظر سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنا مقام ومنصب اور مقصد زندگی متعین کریں۔ یعنی ہم جب کسی تعمیری پروگرام یا نظام اجتماع کو اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس امر کے متعلق دو ٹوک فیصلہ کریں کہ ہماری حیثیت مسلمان کی ہے یا نا مسلمان کی! اور یہ کہ ہم مسلمان کی حیثیت سے حیات اجتماعیہ کے تعمیری مراحل طے کرنا چاہتے ہیں یا غیر مسلم کی حیثیت سے؟ ہر صورت میں ہمیں ایک نہ ایک مقصدِ زندگی متعین کرنا پڑے گا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو اس مقصد سے مناسبت تامہ رکھتا ہو۔ یہ بات کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہے کہ ہم اپنے سفر کی ایک منزل مقصود متعین کرتے ہیں۔ اور پھر اس مقصد کی جانب رُخ کرنے کے بجائے بالکل اسکی مخالف سمت کی طرف دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح یقیناً ہمارا ہر قدم ہمیں منزل مقصود سے ہٹا کر پیچھے کی طرف لے جائیگا۔

اس سلسلہ میں عقل ونقل اور واقعات کی شہادت کافی ہے کہ کسی قوم کا سیاسی معاشی اور عمرانی غلبہ واقتدار اور ذہنی اخلاقی اور ثقافتی ارتقا محض بخت واتفاق کا نتیجہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اسکے پس پردہ عوامل واسباب کا ایک وسیع سلسلہ موجود ہوتا ہے۔ یعنی اس سے پہلے کہ اس قوم کے ذریعہ کوئی اخلاقی، معاشی یا سیاسی انقلاب بپا ہو یا وہ

دوسری قوموں کو پیچھے ڈھکیل کر اقتدار اعلیٰ کے سیٹج پر قابض ہو، اسکو کئی ایک مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ مراحل کچھ تو قوم کے ذہنی شعور اور وجدانی احساس سے متعلق ہیں اور کچھ اسکے قوائے عمل سے! یہ مراحل کیا ہیں؟ توحیدِ مقصد۔ مقصد کی لگن اور اس کی افادیت کا غیر متزلزل یقین اور آئینی نظم کے تحت اس مقصد کی راہ میں پرخلوص جدوجہد۔ آپ قرآن حکیم کو اس معاملہ میں شاہد بنائیں یا عقل کو اپنا حکم تسلیم کریں، یا اقوام عالم کے تذکروں کو اپنا رہنما بنائیں، یہ تینوں ایک زبان ہوکر یہ فیصلہ سنائینگے کہ اس دنیا میں ان تین امور کے سوا کسی انسانی جماعت نے کوئی مقام شرف حاصل نہیں کیا۔

قرآن، عقل اور تاریخ کو مخاطبین کی رعایت کی خاطر جدا جدا سند قرار دیا گیا ہے۔ ورنہ حقیقت میں یہ تینوں الگ الگ نہیں ہیں۔ اصل سند (اتھارٹی) قرآن حکیم ہی ہے۔ جو علوم یقینیہ کا ماخذ ہے۔ عقل اسکے حقائق کو ہر زمانہ کے ماحول پر منطبق کرنے میں مدد دیتی ہے، اور قرآنی حقائق و معانی کے خارجی اور کائناتی مظاہر کو تذکرہ و تاریخ کا نام دیا گیا ہے۔ اسلئے عقل سلیم کا کوئی فیصلہ قرآن حکیم کے خلاف نہیں ہوتا اور تاریخ کا کوئی واقعہ "سنتہ اللہ" یا "فطرت اللہ" (جسکی صرف قرآن ہی ترجمانی کرتا ہے) کے خلاف عالم وجود میں نہیں آتا۔

بہرحال ہم جب ملت کی تعمیر جدید کا عزم رکھتے ہیں تو سب سے پہلے ہم دینی حیثیت متعین کرینگے کہ ہم بحیثیت مسلمان کے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟

اگر یہ بات ہے تو پھر ہمارا مقصد حیات عصر حاضر کی دوسری قوموں سے بالکل الگ اور اس مقصد کے حصول کا طریق کار دوسروں سے قطعی مختلف ہوگا۔ کیونکہ ہم جب اسلامی تصور زندگی سے اپنے تئیں منسوب کرتے ہیں۔ تو اسکا مطلب بجز اسکے اور کیا ہوسکتا ہے کہ اس متعین نظریۂ زندگی سے ہمیں گہری عقیدت ہے اور اسکی افادیت پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ اس ایمان و یقین کا قدرتی اقتضا یہی ہوسکتا ہے کہ جو نظام حیات اس نظریہ پر مبنی ہے ہم اس پورے نظام کو اپنی پوری زندگی میں دخیل بنائیں۔ اسکے ایک ایک مطالبہ کی تکمیل کے لئے ہم اپنے آپ کو آمادہ کریں۔ اور اسکی ہر شق کو زندگی کے اس زاویہ پر منطبق کریں جو اس شق کا معروض ہے۔ یہ پرلے درجہ کی منافقت ہے کہ ہم زبانی طور پر اسلامی نظریۂ زندگی سے اپنی عقیدت کا اظہار کریں۔ اور عملی لحاظ سے اسکے نظام اجتماع و تمدن اور معیشت و سیاست سے اپنے آپکو دور رکھیں۔ آخر آپ زبان سے جس کی عقیدت کا اعلان کرتے ہیں اُسکو اپنی عملی زندگی میں جگہ نہ دینے کا اسکے سوا کیا مطلب ہوسکتا ہے کہ آپکا دل اس چیز کی محبت و عقیدت سے خالی ہے۔ اور محض نمائشی طور پر یا کسی خاص مصلحت کے پیش نظر آپ یونہی اسکی عقیدت کا ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں۔ اگر یہ بات ہے تو پھر اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ علی الاعلان اسلامی نظریۂ زندگی سے انکار کردیں۔ اور اپنی قوم کو کسی دوسرے نظریۂ زندگی پر اکٹھا کریں۔ اس جرأت مندانہ اقدام سے اور نہیں تو

کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ آپ کی قوم مادی طور پر دوسری قوموں کی طرح ترقی کر سکے گی۔ کیونکہ اس صورت میں پوری قوم کے سامنے ایک واضح اور غیر مبہم مادی یا قومی نصب العین ہوگا۔ مگر اس صورت میں جبکہ آپ کے دل و دماغ کافرانہ تصور زندگی سے متاثر ہیں۔ اور زبان سے آپ اسلام کے تصور حیات کی عقیدت کا اعلان کر رہے ہیں تو قدرتی طور پر قوم میں فکری اور ذہنی تحزب و انتشار اور اسکے تو سے عمل میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوگا۔

محض سطحی نظر رکھنے والا شخص بھی اتنی بات سمجھ سکتا ہے کہ جس قوم کے اصحاب حل وعقد نے اپنے لئے در پردہ ایک منزل مقصود متعین کر رکھی ہو، اور وہ جب اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوں تو اس کو اس منزل کی راہ و رسم سے ناآشنا رکھکر ایک دوسری منزل کی نشان دہی کرتے ہوں تو اس سے لازماً قوم ذہنی اور فکری اعتبار سے دو یا دو سے زائد گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک گروہ کا رخ لنڈن اور واشنگٹن کی طرف ہے۔ دوسرے کا ماسکو کی جانب اور تیسرے کا کعبۃ اللہ کی سمت کو! ظاہر ہے کہ جو قوم اپنے سامنے کوئی واضح اور متعین مقصد نہ رکھتی ہو، بلکہ مقصدی لحاظ سے اس کے افراد میں کسی طرح کی ہم آہنگی نہ ہو اس کا انجام اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ

خسر الدنیا والاخرہ، ذالک ھو الخسران المبین

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کے معروف نظام ہائے سیاست واجتماع کے خاص خاص اجزا کو ملا کر ایک جدید نظام اجتماع مرتب کیا جائے جس میں کچھ اسلامی اصول سیاست ومعیشت کے لئے بھی گنجائش رکھی جائے۔ اور پھر اس پر اسلامی نظام سیاست کا لیبل لگا دیا جائے۔ اس چالاکی سے عوام کو مطمئن کر دیا جائے گا۔ اور خود ارباب سیاست کو اپنا رخ پلٹنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ بلکہ جس طرف کو وہ جانا چاہتے ہیں، بے روک ٹوک بڑھتے جائینگے۔

یہ اتنی بڑی حماقت ہے کہ اس سے بڑی حماقت کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل ہر فلسفۂ زندگی ایک مستقل اور الگ تھلگ نظام حیات کی تشکیل کرتا ہے۔ اور وہ اس نظام کے مختلف اجزا میں نظم وترتیب پیدا کر کے اسکو ایک مخصوص طبیعت اور مخصوص مزاج عطا کرتا ہے۔ اور پھر اس خارجی نظام کی مخصوص فطرت اور مزاج کے مطابق ہی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر آپ اشتراکی نظام کا تجزیہ کرینگے تو اسکے ہر جزو میں وہ مخصوص تصور زندگی یعنی معاشی مساوات کا تصور جو فلسفۂ اشتراکیت کا محور ہے، کارفرما نظر آئیگا۔ اور یہ نظام جو اس فلسفۂ زندگی پر مبنی ہے اپنے فطری اور طبعی اقتضا سے کم وبیش مطلوبہ نتائج پیدا کرے گا۔ اسی طرح اسلامی نظام کا تجزیہ کیجیے۔ تو اسکے ہر جزو میں اسلام کا اخلاقی اور مابعد الطبیعی تصور روح کی طرح جاری وساری نظر آئیگا۔

بالفاظ دیگر اول الذکر نظام حیات میں حیات اجتماعیہ انسانیہ کے صرف خارجی اور مادی احوال وشئون کے ارتقا کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ اور دوسرے نظام میں تصفیۂ روح اور تہذیب النفس کو اولین مقام دیا گیا ہے۔ گویا ان میں سے کسی ایک نظام کو قبول کرنا، دوسرے کی نفی کو مستلزم ہے۔ لہذا ان دونوں کو ان کی روح سمیت اگر آپ ملانا چاہتے ہیں تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آپ آگ اور پانی کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کی کوشش کریں۔ اور اگر اسلامی نظام کو مستقل حیثیت سے قبول کر کے اشتراکیت یا مغربی جمہوریت کے مفید اور کارآمد اجزا کو تابع کی حیثیت سے لینا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ اجزا نظام اسلامی کی روح پر اثر انداز نہ ہوں۔ بلکہ خود ان میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ نظام متبوع میں کھپ سکیں اور اسکی روح کو قبول کر سکیں۔ لیکن اس میں مشکل یہ ہے کہ مَاصَفَا اور ماکدر کی تشخیص و تعیین کے لئے آپ کے پاس کیا معیار ہوگا۔ اور اس کام کے لئے آپ کن لوگوں پر اعتماد کرینگے؟

اگر فی الواقع صدق دل سے اور خلوص نیت سے آپ چاہتے ہیں کہ ملت اسلامیہ کی سیاسی، معاشی اور عمرانی ترقی اور اجتماعی و ملی تعمیر اسلامی فلسفہ حیات کے زیر اثر تکمیل پذیر ہو تو اسکے لئے یقیناً قرآنی اصول حکمت کی روشنی میں تعمیری لائحہ عمل اور مکمل دستوری خاکہ مرتب کرنا ہوگا۔ جس میں اوّل سے آخر تک اسلامی روح کارفرما ہو۔

اور اگر جزئیات و تفاصیل مرتب کرنے میں ہمیں دوسرے نظاماتِ سیاست سے مدد لینی پڑے تو اس میں کوئی بُری بات نہیں ہے۔ مگر یہ کام ایسے لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا جو دینی بصیرت اور قرآنی فہم سے بالکل تہی مایہ ہیں۔ اور نہ ان لوگوں پر اکتفا کی جا سکتی ہے جو علوم اسلامیہ سے واقف ہیں۔ لیکن عصر حاضر کے جدید سیاسی تصورات اور بین الملی قانون سے نابلد ہیں۔ بلکہ اس مقصد کے لئے ان دو قسم کے لوگوں کا باہم مخلصانہ تعاون ناگزیر ہے۔

ر نیز یہ شخصی اور انفرادی فریضہ نہیں ہے، بلکہ اجتماعی اور ملّی فریضہ ہے۔ اور مرکز ملت کے توسط سے انجام پذیر ہو سکتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر تعمیری پروگرام یا نظام مملکت کی دفعات مرتب کرنا شروع کر دے تو اس سے شدید قسم کا طبقاتی اور جماعتی تصادم رونما ہو گا۔ ہر جماعت ایک الگ تعمیری لائحہ عمل مرتب کر کے اسکی عظمت و یکتائی کی قصیدہ خوانی اور دوسری جماعتوں کے تعمیری مسودات کی تنقیص شروع کر دے گی۔ اور اس سے مملکت میں ایک عام ذہنی انتشار پیدا ہو گا۔ اور پھر انفرادی کاوش خواہ کتنی ہی کارآمد اور بیش قیمت کیوں نہ ہو معاصرانہ رقابت سے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی کوشش ثمر بار ہونے کے بجائے مضر نتائج پیدا کرتی ہے۔

ایک اہم سوال اور اُسکا جواب

کہا جاتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی کو جو اسوقت محض نظری حیثیت

سے متعارض ہے، جدید مادی ماحول پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے؟
اس سوال کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ لیکن یہ سوال اُٹھانے والے حضرات اگر اس مسئلہ پر کچھ وسعتِ نظر سے غور کریں تو اسکا حل اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کہ اسے مشکل سمجھ لیا گیا ہے۔

در اصل ہمارے سامنے یہ سوال نہیں ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات کو عملی طور پر جدید مادی ماحول پر کیسے منطبق کیا جا سکتا ہے، بلکہ سوال یہ ہے کہ اسلامی فلسفۂ زندگی کے ذریعہ اس خالص مادی ماحول کو کس طرح بدلا جا سکتا ہے؟ جس سے نظام اسلامی اور ہمارے ماحول میں ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ اگر آپ موجودہ غیر متوازن اور غیر صالح ماحول کو جوں کا توں برقرار رکھکر اسلامی نظام کو اس پر حاوی کرنا چاہتے ہیں تو بلا شبہ یہ کام غیر ممکن ہے۔ کیونکہ نظام اسلامی کا لباس کسی ایسے بد وضع، غیر متوازن اور متجاوز القامت جسم کے لئے بنا ہی نہیں ہے۔ نظام اسلامی کا عملی نفاذ سب سے پہلے معاشرہ کے غیر فطری نشیب و فراز ہی سے تعرض کریگا۔ اور اسکو ایک ہموار اور متوازن شکل و صورت عطا کریگا۔

در اصل موجودہ مسلمان عصر حاضر کے تہذیبی اور تمدنی ارتقا سے کچھ اس طرح مرعوب ہو چکا ہے کہ اسکے مقابلہ میں اسکو اپنی ہر چیز حقیر نظر آتی ہے، مگر وہ اس حقیقت سے آج تک بے خبر ہے، جس کو خود اہل فرنگ کے بہت سے بالغ النظر اور سنجیدہ فکر لوگوں نے آج محسوس کر لیا ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ تہذیب حاضر کی عظمت و ترقی کی رفتار بلا شبہ

حیران کن ہے۔ مگر یہ رفتار ترقی انسانیت کے لئے قابل فخر نہیں ہے بلکہ باعث صد عار ہے۔ انسانیت کو ایسے تمدنی ارتقا کی ضرورت ہے جو تمام انسانی قوی کو کمال کی طرف لے جائے اور فضائل انسانیت کا کوئی زاویہ اسکی نگہ التفات سے محروم نہ ہو۔ مگر تمدن جدید کی حالت یہ ہے کہ اس نے مادی پہلو کے لحاظ سے انسان کو انتہائی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ اور اسکی روحانی صلاحیتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی مجموعی طور پر مستقل اور بربادی کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس بنا پر تہذیب جدید کی ارتقائی حرکت غیر متوازن اور سراپا ہلاکت آفریں ہے۔ اور حق یہ ہے کہ آج انسانوں کو اس پر خطر راہ سے ہٹا کر فکر و عمل کی صراط مستقیم کی طرف لے جانا ہی انسانیت کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اور یہ کام جتنا دقت طلب اور کٹھن ہے اتنا ہی شاندار نتائج کا حامل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ذہنی طوائف الملوکی اور عملی انتشار کے اس ہیجانی دور میں سب سے پہلے معاشرہ کے تمام اجزا فکر و عمل پر حکیمانہ نگاہ ڈالنی چاہیئے اور انتہائی محنت و تفحص سے اسکے بیمار جسم کے ایک ایک عضو کا تشخیصی معائنہ کرنا چاہئے۔ جو حصے صحت مند اور کار آمد ہیں ان کو باقی رہنے دیا جائے۔ اور جو حصے معمولی تدبیر و اصلاح سے کار آمد ہو سکتے ہیں ان کی اصلاح پر ہی اکتفا کی جائے اور جو حصے جراثیم زدہ اور سمیت آلود ہیں ان کو کاٹ کر پھینک دیا جائے

اس معالجاتی عمل کے بعد ہمارے ماحول کا مادی پھیلاؤ یقیناً سمٹ جائے گا۔ لیکن وہ روحانی فیوض و کمالات کی مدد سے بجا طور پر صحت مند متوازن اور پُر امن نظام تمدن کا ساتھ دے سکے گا۔ اور پھر اس جدید تمدن کی ارتقائی حرکت یک طرفہ نہیں ہوگی، بلکہ انسانیت کے تمام ذہنی، روحانی اور عملی کمالات سے ہم آہنگ ہوگی۔ اس لئے یہ ہلاکت آفریں ہونے کے بجائے دنیائے انسانیت کے لئے سراپا رحمت ہوگی۔

بہرحال ہمیں جب مقصد کی افادیت کا کامل یقین ہوگا اور ذہنی عزم کے ساتھ اسکے حصول کی جدوجہد کا آغاز کرینگے تو پیش آنے والے جدید مسائل کا حل بھی ساتھ ساتھ ہی نکلتا جائے گا۔ لیکن اگر ابتدا ہی سے ہمارا یقین متزلزل ہے۔ اور آغاز کار سے پہلے ہی ہم کسی ایسے نظام حیات کا مطالبہ کرتے ہیں جو روز اول ہی سے تمام جزئیات و تفاصیل پر حاوی ہو، تو یہ کام دشوار ہی نہیں، بلکہ ناممکن ہے، اور پھر آپ کوئی ایسا نظام سیاست پیش کر سکتے ہیں جو یک لخت تمام تفصیلی مسائل کا حل اپنے اندر رکھتا ہو؟ جب حالاتِ زمانہ اور ماحول ہر لمحہ رو بہ تغیر ہیں، تو ہر نظامِ زندگی کے تفصیلی جزئیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک نظامِ اسلامی کے بنیادی تصورات کا تعلق ہے۔ وہ ہر لحاظ سے جامع اور مکمل ہیں۔ غرض یقین محکم اور عزم صمیم کے سوا کسی نظریۂ زندگی کو عملی حیثیت

سے ہرگز روشناس نہیں کرایا جا سکتا، اور نہ ہی اُس کو گرد و پیش کے مادی ماحول پر منطبق کیا جا سکتا ہے۔

دورِ ماضی کی تعمیری اور انقلابی کوششوں پر

ایک تنقیدی نظر!

گذشتہ باب میں پیغمبرانہ دعوت و انقلاب کے اصول و مبادی کتاب و سنت کی روشنی میں بیان کئے گئے ہیں۔ تاکہ ان سے مستقبل کی تعمیر جدید کے کام میں استفادہ کیا جاسکے۔ لیکن قبل اسکے کہ ہم عہدِ حاضر کے اجتماعی مفاسد کے پیش نظر انقلابی جدوجہد کی نوعیت متعین کریں۔ یہ ضروری ہے کہ دورِ ماضی کی تعمیری اور انقلابی کوششوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالیں تاکہ ہم یہ اندازہ کرسکیں کہ تاریخ کے ہر دور میں اجتماعی تحریکوں سے جو نتائج برآمد ہوئے اور تجدیدی شخصیتوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان سے ملت کو کیا کیا فائدے پہنچے۔ اور دورِ حاضر کی اصلاحی تعمیری اور انقلابی جدوجہد میں ہم ان کے کارناموں سے کس حد تک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ نیز ہم یہ بھی معلوم کرسکیں کہ یہ لوگ دعوتِ اقامتِ دین کے ذریعہ مسلمانوں کی حیات اجتماعیہ میں کامل اور صالح انقلاب بپا کرنے میں کیوں ناکام رہے ہیں؟ اور ان کی ناکامی کے اسباب و وجوہ

کیا ہیں؛ تاکہ ہم ان اسبابِ ناکامی سے بچ کر آگے کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ مگر اس موقع پر ان کوششوں کا احاطہ و استیعاب مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ اصل مقصد ان کوششوں کی نوعیت متعین کرنا، اور ان سے اصولی بحث کرنا ہے۔

دورِ ماضی کی ان کوششوں کو ہم تین اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) دعوتِ عامہ کی راہ سے محض حصولِ اقتدار کی کوششیں (۲) دعوتِ عامہ کے ذریعہ حیاتِ اجتماعیہ میں صالح انقلاب پیدا کرنے کی کوششیں۔ (۳) محض علمی استدلالی اور تعمیری کوششیں۔

دعوتِ عامہ کی راہ سے جاہ طلبی

اس طرز کی اجتماعی تحریکیں ہر دور میں بکثرت اُٹھتی رہی ہیں۔ اور ان کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں دین، مذہب، حزبی عقائد و افکار برسرِ اقتدار طبقہ کے ظلم و تشدد سے گلو خلاصی اور معاشی و سیاسی حریت و آزادی کے خوشکن اور دلفریب نعروں سے عوام میں اثر و نفوذ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور حکومتِ مسلطہ کا تخت اُلٹنے کی جارحانہ مہم کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اس نوع کی کوششوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کو ضبطِ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ یہاں صرف چند مثالوں پر ہی اکتفا کی جائیگی۔

کوفہ میں مختار ثقفی نے دعوت شروع کی۔ اسکی دعوت شیعی عقیدہ پر مبنی تھی۔ اس شخص نے عوام میں اثر و رسوخ پیدا کرنے کے لئے حضرت امام حسینؓ

کے واقعہ شہادت کو پرجوش نعرہ کے طور پر استعمال کیا۔ اور یہ امام موصوف کے انتقام اور محمد بن علی (جو اولاد علی میں سب سے بڑے تھے) کی خلافت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا تھا۔

خوارج کی دعوت بھی اسی نوعیت کی تھی۔ ان کے کچھ مخصوص عقائد تھے جنکو وہ نہایت معصومانہ انداز میں پیش کرتے تھے۔ ان کا نعرہ "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ" تھا۔ لیکن اسکی تہ میں ان کی سیاسی اغراض کارفرما تھیں۔

حمیمہ میں علی بن عبداللہ بن عباس نے دعوت کا آغاز کیا۔ اور شیعہ کیسانیہ نے اس کا ساتھ دیا۔ اسکی دعوت بھی شیعی عقیدہ یعنی اہل بیت کی محبت۔ اور ان کے استحقاق خلافت کے تصور پر مبنی تھی۔ لیکن یہ شخص بڑا عقلمند اور سیاست کار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حکومت میں انقلاب لانے کے لئے امت میں ذہنی تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے۔ اور ناگہانی طور پر جو انقلاب بپا کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ ہمیشہ ضعف و کمزوری اور ناکامی ونامرادی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے باضابطہ طور پر داعی مقرر کئے۔ اور ان کو ملک کے کونے کونے میں بھیج دیا۔ یہ لوگ اہل بیت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے۔ کوفہ اور خراسان میں اسکی دعوت کے مرکز تھے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کوفہ میں اہل بیت کو ماننے والے زیادہ لوگ ہیں اور خراسانیوں میں بنو امیہ کے خلاف عام نفرت ہے۔ جسے باسانی ابھارا جا سکتا ہے۔ ابومسلم خراسانی کے شمول سے پہلے دعوت محضہ کا

سلسلہ جاری رہا۔ اور اسکے بعد باقاعدہ فوجی مہم کا آغاز ہوا۔ اور اسکے نتیجہ میں بنو امیہ کا اقتدار ختم ہوا۔ اور بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی، جو قریباً چھ سو سال تک جاری رہی۔

اسی طرح محمد بن تومرت جو سوس کا باشندہ اور امام غزالی کا شاگرد تھا۔ ۵۱۵ھ میں اس نے پہلے پہل امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کام سے دعوت کا آغاز کیا۔ جب مریدین کا حلقہ بڑھنے لگا تو مہدیت کا دعویٰ کیا اسکے مریدین "الموحدون" کے نام سے مشہور تھے۔ اور اس نے اپنے مریدوں کو دس طبقوں میں تقسیم کیا تھا۔ سب سے پہلے دعوت قبول کرنے والے "الجماعۃ" کے نام سے موسوم تھے۔ عبد المومن بن علی کو اس نے اپنا پہلا جانشین بنایا۔ یہ شخص بڑا ذہین اور دلیر تھا۔ اسی نے مراکش پر قبضہ کرکے المرابطون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ محمد بن تومرت کو اس سے بہت محبت تھی۔ چنانچہ اسکی نسبت اس نے یہ شعر کہے تھے۔

تکاملت[۱] فیک اخلاق خصصت بہا ... فکلنا بک مسرور ومغتبط
فالسن ضاحکۃ والکف مانحۃ ... والصدر منشرح والوجہ منبسط

اسماعیلیوں کی دعوت بھی اسی زمرہ میں شامل ہے جسکے نتیجہ میں دولت فاطمیہ کا قیام عمل میں آیا۔

---

[۱] تجھ میں وہ اخلاق درجۂ کمال کو پہنچ گئے ہیں جو تیرے ساتھ ہی مخصوص ہیں پس ہم سب تیری ذات سے خوش اور تجھ پر رشک کرنے والے ہیں، پس دانت ہنسنے والے ہیں، ہتھیلی بخشنے والی، سینہ کھلا ہوا، اور چہرہ کشادہ ہے۔

غرض اس طرح کی اجتماعی تحریکیں ہر زمانہ میں اٹھتی رہی ہیں۔ اور اُن کے مفاسد میں سے ایک بڑا اور بنیادی مفسدہ یہ ہے کہ ان کے ظاہر و باطن میں تضاد ہوتا ہے۔ اور دوسرا نقص یہ ہے کہ ان تحریکات کے علمبرداروں نے انقلاب بپا کرنے میں وہ طریق کار اختیار کیا جو غیر مسلموں کے مقابلہ میں کیا جانا چاہئے تھا یعنی حملہ و ہجوم اور فوجی اقدام کافر حکومتوں کے مقابلہ میں کیا جاتا ہے۔ اور جہاں ملت کے اندر ہی انقلاب لانا مقصود ہو تو اسکا طریق کار یہ ہے کہ عوام المسلمین کی اصلاح و تعمیر سے رائے عامہ کو منظم کیا جائے اور جمہوری طریقوں سے سیاسی انقلاب بپا کیا جائے کبی گذشتہ باب میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اس قسم کی تحریکوں سے بے شمار مفاسد کے دروازے کھل گئے اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔

دعوتِ عامہ کے ذریعہ صالح انقلاب بپا کرنے کی کوششیں

اس قسم کی تحریکیں بھی بنو امیہ کے ابتدائی دور سے آج تک چلتی رہی ہیں۔ سب سے پہلے یزید کی حکومت کے خلاف اہل مدینہ نے علم جہاد بلند کیا۔ اسکے نتیجہ میں حرہ کا معرکہ پیش آیا۔ اور مسلم بن عتبہ المری نے داعیان انقلاب کو تہ تیغ کیا۔ واقعہ کربلا، عبداللہ بن زبیر کی دعوت، واقعۂ قرا، جس میں عراق کے علما نے بنی امیہ کے خلاف جنگ آزمائی کی۔ نفس زکیہ کا واقعہ جس میں سادات اور علماء حجاز نے مل کر دولت عباسیہ کے خلاف علم جہاد بلند کیا۔ اور اس قسم کی اجتماعی تحریکوں جن کا مقصد کسی نہ کسی رنگ

میں دینی انقلاب پیدا کرنا اور فساق کے اقتدار کو ختم کرنا تھا) کی ایک بڑی خامی یہ تھی کہ ان میں حالات کا ٹھیک ٹھیک جائزہ نہیں لیا گیا اور دعوت و اصلاح اور تعمیر فکر کے ذریعہ رائے عامہ کا اعتماد حاصل کئے بغیر ہی انقلابی جدوجہد شروع کر دی گئی۔ نیز یہ اصولی نقص یہاں بھی موجود تھا کہ ان لوگوں نے حملہ و ہجوم اور تشدد کے ذریعہ انقلاب بپا کرنا چاہا۔ حالانکہ ملت کے اندر صالح انقلاب بپا کرنے کا یہ طریقہ نہیں تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔ چنانچہ مرکز ملت کی اطاعت کے باب میں جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں مرکزیت کا تحفظ و احترام اور امیر کی اطاعت اس وقت تک ضروری ہے جب تک کہ امیر واضح اور بین کفر کا ارتکاب نہ کرے۔

الا ان تروا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان (بخاری)

یعنی امراء و حکام خواہ فسق و معصیت اور ظلم و تشدد پہ اتر آئیں۔ لیکن جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کریں اور کفر صریح کے مرتکب نہ ہوں اس وقت تک ان پر خروج کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ ملت کی مصلحت عامہ کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی مرکزیت بہرحال محفوظ رہنی چاہیئے۔ اور کفر و شرک کو چھوڑ کر باقی تمام مفاسد لامرکزیت اور طوائف الملوکی کی نسبت بہرکیف کم تر ہیں۔ اسلئے مرکزیت کی خاطر ان مفاسد کو برداشت کر لینا چاہیئے۔ ہاں مسلمانوں کی تعمیر و اصلاح اور رائے عامہ کی تنظیم کے ذریعہ صالح انقلاب بپا کرنے کے

دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ اگر اس طریقہ سے کوئی منظم اور اصولی تحریک شروع کی جاتی تو کامیابی یقینی تھی۔ لیکن ایسا نہ کرنے سے فتنوں کے دروازے کھلتے گئے۔

تیرہویں صدی ہجری میں حضرت سید احمد اور حضرت اسماعیل شہید کی تحریک جہاد و اقامت دین کو اس لحاظ سے مذکورہ تحریکات کی صف میں شامل کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد بھی اعلاء کلمۃ الحق اور احیا دین تھا۔ لیکن مقصد سے قطع نظر اس تحریک کی نوعیت بالکل الگ تھی یعنی یہ تحریک مسلمان اولی الامر کے مدمقابل نہ تھی۔ بلکہ اہل کفر کے ظالمانہ تسلط کے خلاف چلائی گئی تھی۔ اسلئے یہ تحریک اصولاً بالکل درست تھی اسکے علاوہ اس تحریک جہاد کے علمبرداروں نے خالص اسلامی تصورات کی بنیادوں پر جماعت کو منتظم کیا۔ اور پھر احیاء و اقامت دین کے پاکیزہ مقصد کے لئے موزوں مرکز تجویز کیا، اہل کفر سے مسلسل لڑے۔ شروع شروع میں نمایاں کامیابی ہوئی۔ اور مختصر سے خطہ ارضی میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کی۔ غرض ان سرمستان خمخانۂ احدیت اور بلاکشان راہ حریت نے تھوڑی سی مدت میں وہ کچھ کر دکھایا، جس کے لئے اہل نظر صدیوں سے ہمہ تن چشم انتظار تھے۔ مگر کچھ اسباب عادیہ کی وجہ سے انکی یہ کامیابی ناکامی سے بدل کے رہ گئی۔

ان پرجوش اور سراپا خلوص مجاہدین راہ حق کی ظاہری ناکامی کا سب سے بڑا سبب ایک ہی ہے کہ مرکز کے استحکام و قوت کے لئے جس طرح کی عملی

اور احتیاطی تدابیر کسی ایسی اصولی تحریک کو چلانے کے لئے ناگزیر ہوتی ہیں، ان کو بروے کار لانے میں بڑی حد تک بے اعتنائی کی گئی تھی۔ اتنی بڑی مہم کو اسکے کارکنوں کی معمولی سی لغزش سے بسا اوقات اتنا بھاری نقصان اٹھانا پڑتا ہے جسکی تلافی کسی صورت میں ممکن نہیں ہوتی۔ میں نے جہاں تک اس تحریک کا مطالعہ کیا ہے اور اس جماعت کے لیڈروں سے عقیدت وارادت کا تعلق رکھنے والے قابل اعتماد لوگوں سے جو کچھ سُنا ہے اس کے پیش نظر اس تحریک کی ناکامی کے بارے میں میری قطعی رائے یہ ہے کہ ان مردانِ راہِ حق نے ابتدا کار ہی میں پٹھانوں کے کچھ خود غرض اور ہوس پرست پیروں اور ملّاؤں پر اتنا اعتماد کیا جسکے وہ ہرگز اہل نہ تھے۔ ان لوگوں کی مومنانہ شکل وصورت اور تقوی وطہارت کے ظاہری نقوش کو دیکھکر یہ خیال کر لیا کہ یہ لوگ اندر سے بھی مخلص ہوں گے۔ اور ان پر اتنا بھروسہ کیا کہ ان کو تحریک کی ہائی کمان میں شامل کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت کے رازہائے سربستہ ان بندگانِ ہوس کے ذریعہ افشا ہونے لگے۔ میرا خیال ہے کہ خوانین سرحد کی مسلح بغاوت اور مجاہدین کا قتل عام ان لوگوں کے ایما سے ہوا۔ چنانچہ ذیل کے قرائن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ بعد میں سرکار برطانیہ نے اس طرز کے پیروں اور پیر پرست ملاؤں ہی کے ذریعہ سے اس تحریک کے علمبرداروں کو کافر، اور وہابی ثابت کرنے کی مہم شروع کی۔ اور اس میں اسکو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کو ناکام بنانے میں ان بندگانِ نفس نے جو پارٹ ادا کیا یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ تاریخ کے ہر دور میں مذہب اور دین کو ذریعہ معاش بنانے والے، تسبیح و سجادہ کی آڑ میں شکار کھیلنے والے اور کتاب اللہ کو بیچ بیچ کر کھانے والے اہل خانقاہ اور اہل مدرسہ یہی کچھ کرتے چلے آئے ہیں۔ اور آج بھی یہی کچھ ہو رہا ہے۔ دین اور ملت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو انکی دست درازیوں سے مجروح نہ ہوا ہو، کبھی یہ ملوک و سلاطین کے آلۂ کار بنے، اور اہل حق کو ان کے ہاتھوں رسوا کرایا۔ کبھی اہل کلیسا سے ساز باز کی اور ان کے اقتدار کے لئے دعائیں مانگیں، اور کبھی اہل دیر کے حاشیہ بردار بن کر ان کی قصیدہ خوانی کی۔

گاہے اورا با کلیسا ساز باز — گاہے او با دیریاں اندر نیاز
دین او آئین او سوداگری است — عنتری اندر لباس حیدری است (اقبال)

حاصل یہ ہے کہ اس تحریک جہاد کے رہنما اگرچہ خلوص و ایمان کے پیکر تھے۔ اور ہم جب ان کے محیر العقول کارناموں کو دیکھتے ہیں تو بے ساختہ ہماری توجہ تیرہ سو سال پیچھے کی طرف پھر جاتی ہے۔ اور بلا شبہ ان لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی سیرت قابل رشک تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چھوٹے بڑے واقعہ کے پیچھے علل و اسباب کا وسیع سلسلہ کار فرما ہوتا ہے۔ ایک تاجر لاکھوں کے سرمایہ سے تجارت شروع کرتا ہے تو محض اس کا خلوص و ایمان اسکی کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اصول تجارت اور اسباب و وسائل سے کام نہ لے ورنہ

ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسکو ناکامی سے نہیں بچا سکتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اقامت دین کے لئے مدینہ منورہ کو مرکز بنایا۔ وہاں پہنچ کر آپ نے ایک نہایت مختصر سی ریاست قائم کی، مدینہ کی آبادی کا ایک موثر عنصر یہود تھے۔ ان سے جاتے ہی باقاعدہ معاہدہ کیا۔ تاکہ ان کی شرارتیں محدود ہو جائیں۔ مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم میں پوری قوت صرف فرمائی۔ اور جو لوگ کئی مرتبہ امتحان و آزمائش کی بھٹی میں پڑ کر نکھر چکے تھے۔ صرف ان کو اعتماد کا اہل تصور کیا۔ خبیث اور طیب کا امتیاز کرنے میں انتہائی محنت و توجہ سے کام لیا اور اس طرح چند مخلص مسلمانوں کی مختصر سی فوج تیار کی۔ جس نے ایران و روما کی مہذب اور طاقتور سلطنتوں کو تہ و بالا کر دیا۔

اسی طرح اگر تیرہویں صدی کے ان مردان حق کی یہ مقدس جماعت ان پیروں اور ملاؤں کو جانچ قول اور تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر ان پر اعتماد کرتی تو حالات کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

علمی، استدلالی اور تعمیری جدوجہد

جب ہماری نگاہ تجسس ماضی کی طرف اٹھتی ہے تو ایک طرف دین و مذہب کے پردے میں جنگ اقتدار اور تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآنی اصول و احکام کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششوں کا ایک خوفناک منظر سامنے آ جاتا ہے۔ اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ رب العزت کی طرف سے ارباب عزیمت کے ذریعہ تجدید و احیاء دین کا مسلسل اہتمام

ہو رہا ہے۔ جب بھی بندگان ہوس اور پرستاران باطل کوئی نیا فتنہ کھڑا کرتے ہیں تو کوئی مردِ حق اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، جسکی ایک ہی ضرب سے باطل کے پرزے اُڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ حق و باطل اور اسلام و جاہلیت کی یہ آویزش ہر زمانہ میں برابر جاری رہی ہے۔ اور آئندہ بھی جاری رہیگی اور کتنے خوش بخت ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے آپ کو خطرات و مہالک میں ڈال کر اسلام کو جاہلیت کے حملہ و ہجوم سے بچایا۔ اور اسلامی اُصول و نظریات کو از سر نو اجاگر کیا۔ ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اس نوع کی کوششیں جن لوگوں کی طرف سے عمل میں آتی رہی ہیں ان کی پوری تعداد اور ان کے جدا جدا کارناموں سے بحث کرنا بڑا محنت طلب اور مشکل کام ہے۔ اور پھر یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے۔ جس کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ یہاں محض چند مثالوں پر ہی اکتفا کی جائیگی۔

عباسیہ کے دور میں الحاد و بے دینی کا ایک طوفان اُٹھا۔ اور بڑے بڑے ارباب علم و تقویٰ خس و خاشاک کی طرح اس میں بہ گئے۔ پڑھے لکھے لوگوں کا کوئی گھرانہ ایسا نہ تھا جو فلسفۂ یونان کے اوہام و خرافات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ اہل اعتزال اور اہل فلسفہ نے دین کو عقل کا غلام بنا دیا تھا۔ اور دینی نظامِ فکر و عمل کو بالکل محرف کر دیا تھا۔ ان حالات

میں حضرت امام احمد بن حنبل، امام غزالی اور شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ
پیدا ہوئے، جنہوں نے اس نئے فتنہ کو مٹانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی
اس نازک وقت میں جبکہ کلمۂ حق کہنے کی سزا موت تھی یا کم از کم جیل اور
کوڑوں کی مار، ان مردان حر اور بلاکشانِ راہ عزیمت نے صدائے حق
بلند کی اور ان کی پیہم کوششوں سے اہلِ الحاد و زندقہ کے ناپاک
منصوبے ناکام ہو کے رہ گئے۔

امام احمد بن حنبل ایک جلیل القدر امام حدیث اور بلند پایہ مجتہد تھے
انہوں نے علمی طور پر وہی کام کیا جو دوسرے ائمہ قانون و فقہ نے کیا ہے
مگر اس لحاظ سے ان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے کہ ان کے غیر متزلزل
عزم و یقین اور محیر العقول قوتِ کردار نے امت کی خوابیدہ قوتوں کو
بیدار کیا اور اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دی۔ یہاں دوسرے ائمہ
دین کی تنقیص مقصود نہیں ہے۔ انہوں نے جو بلند پایہ علمی خدمات انجام
دی ہیں، امت کی گردنِ تشکر ہمیشہ ان کے احسان سے زیر بار رہیگی
امت کی ذہنی اصلاح و تعمیر میں انہوں نے غیر معمولی طور پر حصّہ لیا اور
راہِ حق میں مصیبتیں برداشت کیں۔ اور انکے علمی کارنامے آج بھی ہمارے
لئے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کے اس بطل جلیل اور علمبردار
علوم نبوت نے راہ حق میں جو آلام و مصائب برداشت کئے ان کے
تصور ہی سے جگر کانپ اٹھتا ہے۔ تین بادشاہوں، مامون، معتصم
اور واثق کے زمانہ میں ان پر مسلسل کوڑوں کی بارش ہوتی رہی۔ اور

اس مردِ حق نے اتنے شدائد و مظالم برداشت کئے کہ پہاڑ بھی انکی تاب نہ لاسکیں، ان کی جلالتِ شان کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے۔ جو ان کے ایک معاصر صاحب علم و تقویٰ کی زبان سے انکی نسبت نکلے تھے۔

قام احمد مقام الانبیا احمد انبیا کے مقام پر کھڑا ہے۔

آخر حضرتِ امام کی جانثارانہ جدوجہد فتنۂ اعتزال کو ختم کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہوئی۔ اور متوکل کے زمانہ میں صورت حال بالکل بدل گئی۔

حجتہ الاسلام امام غزالی نے یونانی عقلیات پر شدید نکتہ چینی کی اسکے بڑھتے ہوئے اثر و وقار کو ختم کیا۔ اور صحیح عقلی بنیادوں پر اسلام کے نظام فکر و عمل کو ترتیب دیا۔ ان سے پہلے فلسفہ یونان کا اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا۔ مگر ان کی علمی اور استدلالی کوششوں نے مسلمانوں کو ازسر نو کتاب و سنت کی طرف متوجہ کیا۔ اس زمانہ کے متصوفین اور اہل مدرسہ کی اصلاح کے لئے بھی انہوں نے جدوجہد کی۔ مگر ان کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی سعی اصلاح کچھ زیادہ بیباک واضح اور نکھری ہوئی نہ تھی۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ کی علمی اور تصنیفی خدمات اس لحاظ سے بہت اونچا مقام رکھتی ہیں کہ انہوں نے معاشرہ کے ایک ایک مرض کی نشان دہی کی۔ جسم ملت میں جہاں جہاں ان کو ابھرا ہوا ناسور نظر آیا وہاں بے باکانہ نشتر رسید کیا۔ اہل خانقاہ کے سراپا غلط تصوف

پر سخت تنقید کی، اہلِ بدعت کی ہوا پرستیوں اور ان کی مشرکانہ رسوم وبدعات کی پوری قوت سے مخالفت کی۔ فلاسفہ اور دیگر فرق باطلہ کے عقائد وافکار کی نہایت موثر انداز میں تردید کی۔ دنیا پرست اور لالچی علماء وصوفیا کی غلط کاریوں کو بے نقاب کیا۔ جہالت وغوایت کے دبیز پردے جو علوم قرآنی پر ان لوگوں نے ڈال رکھے تھے، ان کو چاک کیا۔ اور کتاب وسنت کے حقائق ان کے قلمی جہاد سے ایک دفعہ پھر نکھر کر سامنے آگئے۔

احمد بن تیمیہ بلا کے ذہین تھے۔ زبان میں جادو کا اثر تھا۔ قلم میں بے پناہ طاقت تھی۔ اور ساتھ ہی میدان جہاد کے شہسوار تھے ان کی علمی کوششوں نے قلوب واذہان کو غلط عقائد اور وساوس شیطانی سے پاک کیا۔ اور یورش تاتار میں جب مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ اور وہ تاتاریوں کا نام سنکر سہم جاتے تھے۔ علامہ موصوف کی شعلہ بیانی نے ان کے دلوں میں جوش جہاد پیدا کیا۔ میدان جنگ میں خود ہی عساکر اسلامی کی رہنمائی کی بلکہ نڈر اور بے باک سپاہی بن کر تاتاریوں کے خلاف اس زور سے لڑے کہ ان کے حملوں کو پسپا کر دیا ان کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ علماء دین کا کام صرف درس وافتا اور تصنیف وتالیف ہی نہیں ہے بلکہ جب ملت اسلامیہ خطرات ومہالک میں گھر جائے تو ان کا کام یہ بھی ہونا چاہیئے کہ وہ میدانِ کارزار میں نکل کر دادِ شجاعت دیں۔

ولاتنال بغایر السیف منزلتہٗ ولا تردّ صدود الجہل بالکتب

گیارہویں صدی ہجری میں ایک عظیم المرتبت شخصیت پیدا ہوئی جو دنیائے اسلام میں مجدد الف ثانیؒ کے نام سے متعارف ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دینی انحطاط نقطۂ انتہا پر پہنچ چکا تھا۔ اور اسلامی عقائد و افکار کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں۔ اکبر کی تحریک الحاد و بے دینی نے دین خداوندی کی عظمت دلوں سے بالکل ختم کر دی تھی اور شعائر اسلامی کی علی الاعلان توہین و تذلیل ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں اسلام اور مسلمان کا نام باعث ننگ و عار تھا۔ اور یہ دیکھکر لوگ اسلام سے برگشتہ ہو رہے تھے۔

دوسری طرف علماء دین اور متصوفین کے گروہ تھے جو اسلام کی حقیقی روح سے یکسر تہی مایہ تھے۔ کتاب و سنت سے کسی کا تعلق باقی نہ رہا تھا علماء صرف فقہی موشگافیوں میں اُلجھے ہوئے تھے۔ اور اسی کو وہ دین تصور کرتے تھے۔ اہل تصوف کے یہاں شرک و بدعت کا عام رواج تھا اور انہوں نے اسلامی تصوف کو بالکل ہندی یوگ اور ویدانت ازم بنا دیا تھا۔ ان حالات میں حضرت مجدد سرہندیؒ کے کار تجدید کی ابتدا ہوئی اور انہوں نے کمال جرأت سے ان غلط کار گروہوں کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا۔ علماء کو از سر نو کتاب و سنت کی طرف متوجہ کیا۔ صوفیا کے غیر اسلامی افکار و اعمال اور شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریۂ "وحدت الوجود"[1] پر شدید نکتہ چینی کی۔ اور دین اکبری کی وجہ سے حکومت اور

---

[1] ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود سے اس وقت کے متصوفین بے شمار۔

عوام میں جو مفاسد پیدا ہو گئے تھے، انکی اصلاح کی۔ یہاں تک کہ انکی پر خلوص اور موثر جد و جہد نے اکبر اور جہانگیر کے پروردہ "دین الٰہی" کی چولیں ہلا دیں۔ غیر اسلامی موسوم و بدعات کو یکسر ختم کیا اور حکومت کا رُخ از سر نو اسلام کی طرف پھیر دیا۔

حضرت مجدد سے ایک سو سال بعد جبکہ حکومت مغلیہ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رہی تھی، اہل حکومت، علماء و مشائخ اور عوام خطرناک ذہنی اور عملی انحطاط و تسفل میں پڑ چکے تھے۔ اور دین کی حقیقی روح بالکل ناپید ہو چکی تھی، ایک جلیل القدر اور بالغ النظر اسلامی مفکر حضرت امام ولی اللہ پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے انتہائی گہری نظر سے ملت کے مفاسد کا جائزہ لیا۔ چنانچہ اس دور کے حالات انہوں نے خود ہی بالوضاحت بیان کر دیئے ہیں۔ علما کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں۔

"نہضوا الطلب العلم توصلاً الی العز والجاہ فاصبح الفقہاءُ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حضرت مجدد نے عقل و نقل سے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ انہوں نے وحدت الوجود کے مقابلہ میں "وحدت الشہود" کا تصور پیش کیا، لیکن یہ غلط ہے۔ دراصل ان کے نزدیک وحدت وجود سالک کے مراحل سلوک کا ابتدائی مرحلہ ہے جبکہ وہ حقیقت الامر کے خلاف کائنات کو عین خدا تصور کرنے لگتا ہے۔ اور اسکے بعد بتدریج وہ اس مقام سے نکل جاتا ہے اور آخر میں اصل حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ کائنات کا وجود، وجود باری کا عین نہیں بلکہ غیر ہے، لہذا وحدت وجود کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہے بلکہ یہ محض کشفی و شہودی تصور ہے۔ اور اسی کو وحدت الشہود سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ۱۲

بعد ما کانوا مطلوبین طالبین و بعد ان کانوا اعزۃ
بالاعراض عن السلاطین اذلۃ بالاقبال علیھم -
یہ لوگ عزت اور جاہ تک پہنچنے کے لئے حصول علم پر آمادہ ہوئے ہیں۔
پس فقہا جو اس سے پہلے لوگوں کے مطلوب تھے، اب طالب ہو گئے ہیں
سلاطین سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے پہلے وہ باعزت تھے اور اب
سلاطین کے درباری بننے سے ذلیل ہو گئے ہیں"
صوفیا کی نسبت لکھتے ہیں -
"کرامت فروشان این زمان ہمہ الاماشاء اللہ طلسمات و
نیرنجات راکرامات دانستہ اند - (تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ)
اس زمانہ کے کرامت فروش لوگ باستثنار مشیت الہی، طلسموں
اور علم نیرنج کو کرامت تصور کرتے ہیں"
اسی طرح آپ نے ملوک وسلاطین، امرا، وشرفا، صناع وتجار
اہل فوج، مشائخ زادوں، اور دوسرے طبقوں کو الگ الگ خطاب
کیا ہے - اور ان کے اعمال و اشغال پر نہایت شدید اور مدلل نکتہ چینی
کی ہے - اور ملت کے مفاسد عامہ سے بھی مفصل بحث کی ہے -
حاصل یہ ہے کہ شاہ صاحب کا زمانہ نہایت پر آشوب اور پرفتن
تھا - اور خود شاہ صاحب کو یقین تھا کہ ملت اسلامیہ تسفل وادبار کی
جس منزل پر پہنچ چکی ہے۔ اب اسکا بچ نکلنا بہت مشکل ہے - اور وہ
قدرت کے اس اٹل فیصلہ کے منتظر تھے جو ایسی بدکردار قوموں کے لئے

مقدر ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب کی دوربیں نگاہ اپنے وقت میں آنے والے انقلاب (فک کل نظام) کا تماشا کر رہی تھی۔ اور اہلِ زمانہ کی بدکرداریوں کے انجام کی طرف انہوں نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

کانّ نجوماً ومضت فی الغیاھب عیون الافاعی اورؤس العقارب

جو ستارے تاریکیوں میں چمک رہے ہیں (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ) وہ سانپوں کی آنکھیں یا بچھوؤں کے سر ہیں۔

بہر حال قدرت کا جو فیصلہ تھا وہ ٹل نہ سکتا تھا۔ اور یہ شاہ صاحب کے بس کی بات نہ تھی کہ وہ آنے والے عذاب الٰہی کا رخ پلٹ دیتے۔ ان سے اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ وہ آنے والی نسلوں کے لئے راہِ عمل متعین کر جائیں اور اس کام میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ شاہ صاحب نے کتاب وسنت کی بنیادوں پر فلسفہ حیات ترتیب دیا۔ اور مسلمانوں کی اصلاح وتعمیر اور کامل دینی انقلاب بپا کرنے کا طریق کار تجویز کیا۔ (نور اللہ مرقدہٗ وجعل الجنتہ مثواہ۔)

اس ضمن میں دنیائے اسلام کے مشہور مفکر علامہ اقبال کے علمی اور تعمیری کارنامہ سے اغماض کرنا بھاری ظلم ہوگا۔ بالخصوص جبکہ ان کی کوششیں ہمارے ہی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور عصر حاضر کے جدید مسائل میں ہم ان کے افکار وخیالات سے بہت کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم حضرت علامہ کو مجدد مانتے ہیں۔ کیونکہ شان تجدید کے لئے جس محیر العقول کردار اور روح تقویٰ وجہاد کی ضرورت ہے۔

علامہ موصوف میں بہت کم ملتی ہے۔ اور وہ خود بھی اس بات کے معترف تھے۔ ہم ان کو عصر حاضر کا ایک فقید المثال اور بلند پایہ اسلامی مفکر تسلیم کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کی راتیں رومی کے سوز و ساز اور رازی کے پیچ و تاب میں بسر ہوئیں اور انہوں نے جو کچھ سوچا وہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ لیکن فلسفۂ جہاد و عمل کو انہوں نے نہ اپنے اوپر طاری کرنے کی زیادہ کوشش کی اور نہ ان کے ماننے والوں میں یہ چیز پیدا ہو سکی۔ مگر ان کی علمی اور تعمیری خدمات کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی یہ خدمت ہی کیا کم ہے کہ جب مغربی دہریت والحاد کا سیلاب ملت کی نئی پود کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے تیز رفتاری سے بڑھ رہا تھا تو اس مرد مومن کے وجد آفریں دلنواز اور پُر از حقیقت کلام نے دلوں میں از سر نو اسلام کی عظمت کو تازہ کیا اور زیادہ نہیں تو اسلام کے نام سے ان لوگوں کو گہری عقیدت پیدا ہو گئی۔ اب مسلمانوں میں تقویٰ و طہارت، پاکیزہ سیرت اور اعلیٰ کردار اور روح جہاد پیدا کرنے کا کام باقی ہے۔ اور اگر رب العزت کو اس قوم کی حقیقی اصلاح منظور ہے تو اس کام کے لئے وہ کسی دوسری شخصیت کو پیدا کر دیگا جو اپنے علم و نظر اور عمل و کردار سے معاشرہ میں کامل دینی انقلاب پیدا کرنے میں کامیاب ہو گی۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

علامہ مرحوم کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو ایک ہمہ گیر انسانی، عالمی اور لازماتی تصور حیات کی حیثیت سے متعارف

کرایا۔ اور عصر حاضر کے تصور قومیت (نیشنلزم) کی تباہ کاریوں سے دنیا کو آگاہ کیا۔

تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملت آدم
مکہ نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

حضرت اقبال دینی انقلاب اور خلافت الٰہیہ کے سرگرم داعی تھے مگر اسلئے نہیں کہ وہ خود مسلمان تھے۔ بلکہ اسلئے کہ ان کے نزدیک انسانیت کی حقیقی فلاح و نجات اسکے سوا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور نسلِ آدم کی ہمہ گیر تباہی کا سبب یہ ہے کہ دولت اور دین کو جدا جدا کر دیا گیا ہے۔

ہوئی دولت و دیں میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری ہوس کی فقیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی — دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری
اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی — کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

حضرت اقبالؒ نے اسلامی تصور حکومت کو اپنی نظم "حکومت الٰہیہ" میں خوب واضح کیا ہے۔

بندۂ حق بے نیاز از ہر مقام — نے غلام او را نہ او کس را غلام
بندۂ حق مرد آزاد است و بس — ملک و آئینش خداداد است و بس
رسم و راہ و دین و آئینش ز حق — زشت و خوب و تلخ و نوشینش ز حق
عقل خود بیں غافل از بہبود غیر — سود خود بیند نہ بیند سود غیر
وحی حق بینندۂ سود ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ

مذکورہ علمی اور تعمیری کوششوں پر عمومی نظر

اس طرز کی کوششوں میں ہمیں جو چیز نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان ارباب اصلاح و تجدید کے سامنے یا تو یہ مقصد ہی نہ تھا کہ حکومت و سیاست کا وہ نظام جو سراپا لادینی تصورات پر مبنی تھا یکسر بدل دیا جائے۔ اور خلافت راشدہ کے طریق پر صحیح اسلامی اصول سیاست کے مطابق جدید دینی حکومت کی تشکیل کی جائے اور یا زمانہ کے مخصوص حالات کے پیش نظر ان کو مکمل دینی انقلاب بپا کرنے کے مواقع ہی نہیں حاصل ہو سکے۔ جس کی وجہ سے ان کی کوششیں بیرونی اسباب فساد کے ازالہ و دفاع کے لئے وقف ہو کے رہ گئیں۔ اور اصل سرچشمہ فساد کی طرف وہ توجہ نہ دے سکے۔

تاہم ان ائمہ اصلاح و تجدید کے تجدیدی کارناموں کی نسبت یہ خیال کرنا غلط ہے کہ وہ صرف دور ماضی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور موجودہ دور میں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں اور ہمارے مذہبی اور غیر مذہبی طبقے جن گوناگوں اجتماعی امراض و مفاسد میں مبتلا ہیں ان کی نوعیت بڑی حد تک دور ماضی کے اجتماعی اور ملی مفاسد و اسقام سے ملتی جلتی ہے۔ اور ان حضرات کے علمی اصلاحی اور تعمیری کارناموں سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسلئے انکی یہ علمی کاوشیں وقتی اور محدود نہیں ہیں۔ بلکہ مستقل اور پایہ دار حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آج زندگی کے جو نئے

نئے مسائل ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لئے صرف ماضی کی ان کوششوں پر ہی قناعت کر لی جائے۔ اور اجتہاد فکر سے کام نہ لیا جائے۔ در اصل اپنے زمانہ سے تعلق رکھنے والی کوشش خواہ کتنی ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ مگر وہ ہر زمانہ کے مقتضیات سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتی۔

اسلئے آج جدید حالات و مسائل کے پیش نظر ایک ایسی جدید نہضت علمیہ کی ضرورت ہے جس میں ماضی کے علمی کارناموں کو اتنا ہی دخل ہو جتنا اس زمانہ میں کار آمد ہو سکے۔

ہم آگے چل کر ان علمی کارناموں کے اُن پہلوؤں کو منظر عام پر لائینگے جن سے ہم اپنی تعمیر جدید میں استفادہ کر سکتے ہیں۔

مستقبل کی تعمیر کا نقشۂ کار

ماضی اور حال کے اجتماعی مفاسد کے پیش نظر اور اصلاح و تعمیر کے قرآنی اصول و مبادی کی روشنی میں آج ملت کی تعمیر کا کام کس ڈھنگ سے شروع کیا جائے۔ اور عصر رواں کے جدید تقاضوں کے پیش نظر اس کا طریق کار کیا ہو؟ یہ مسئلہ اپنی غیر معمولی اہمیت کی وجہ سے بہت زیادہ التفات و توجہ کا مستحق ہے۔

یہ بات حقیقتِ ثابتہ کا درجہ رکھتی ہے کہ آج ہم جس دور سے گذر رہے ہیں وہ فکری اور ذہنی انتشار کا سخت ہیجانی دور ہے۔ ملائیت و صوفیت پہلے سے شدید تر شکل میں معاشرہ کو ذہنی انحطاط کی طرف لے جا رہی ہے ملوکیت و آمریت نے آج مغربی جمہوریت کی نقاب اوڑھ رکھی ہے۔ مغرب زدہ طبقے مغربی علوم و افکار اور جدید سیاسی و معاشی تصورات سے متاثر ہیں اور "جاہلیتِ حدیثہ" نے ان کے قلب و دماغ میں اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ اور عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ مذہبی طور پر ملّا و صوفی کے زیر اثر ہیں اور سیاسی طور پر اہل جاہلیت حدیثہ کے آلۂ کار ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں کوئی ایسی اصولی تحریک اُٹھانا جس کا مقصد موجودہ ذہنی

انتشار و طوائف الملوکی کو ختم کرنا، اور خالص دینی بنیادوں پر معاشرہ میں فکری اور اعتقادی وحدت پیدا کرنا ہو، سخت دشوار ہے مگر جس کام سے انسانیت عامہ کی حقیقی فلاح و نجات وابستہ ہو خود غرض طبقوں کی پیدا کردہ مشکلات کی وجہ سے اسکو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ بلکہ حقیقت میں اگر کوئی کام کرنے کا ہے تو وہ صرف یہی کام ہے۔ اور اسکے سوا جو کچھ ہے وہ ہوائے نفس کی پرستش ہے ؎

اگر بایں نہ رسیدی تمام بولہبیست

مگر اس کام کی ابتدا کرنے اور پھر اسکو کامیابی کی منزل تک لے جانے کیلئے ایمان و تقوی غیر متزلزل عزم و یقین، دور رس نگاہ، بے پناہ جوش کردار، ہمت بلند اور ایسی قوت عمل کی حاجت ہے جس سے جاہلیت جدیدہ کی "سد سکندری" پاش پاش ہو کے رہ جائے ؎

ضرب قلندری بیار سد سکندری شکن
رسم کلیم تازہ کن رونق سامری شکن

کام شروع کرنے کے لئے یقیناً ایسے مردان کار کی ضرورت ہے جو ایمان و عمل تقوی و صلاح اور عزم و یقین کی متاع گراں مایہ اپنے ساتھ رکھتے ہوں۔ اور جو لوگ متاع یقین و عمل سے محروم ہیں۔ وہ اس قافلۂ اہل عزیمت کے ساتھ ایک قدم بھی نہیں چل سکتے۔ لہذا کام کا پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقہ سے چن چن کر سامنے لایا جائے اس میں شک نہیں کہ اس زمانہ میں ایسے اصحاب علم و عمل کی قلت ہے مگر یہ

غلط ہے کہ ایسے لوگ اس قوم میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ یقیناً یہ قوم اس درجہ عقیم نہیں ہے۔ اور اسکی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جو مردانِ کار اور ارباب عزیمت سے تہی دامن ہو۔ ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

ان صالح اور باعمل افرادِ قوم کی تنظیم کا مرحلہ بھی بڑا اہم اور کٹھن ہے، اس میں پیغمبرانہ دعوتِ انقلاب کے اصول و مبادی کی رعایت کرنا اور ان غلطیوں سے بچ کر چلنا جن کی وجہ سے ماضی کی انقلابی تحریکیں ناکام رہی ہیں ازلبس ضروری ہے۔

ماضی قریب میں حصولِ آزادی کے لئے جن جماعتوں نے جد و جہد کی ہے۔ انکی ایک بنیادی خرابی یہ تھی کہ ان میں تطہیر و تعمیر فکر کی طرف مطلق توجہ نہیں دی گئی۔ بے حقیقت نعروں اور بے مغز ہنگاموں سے دلوں میں ارتعاش پیدا کیا گیا۔ اور اسکے نتیجہ میں آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر طرف اضطراب و بے چینی کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ فسق و معصیت کا طوفان بپا ہے۔ ذہنی، اخلاقی، اقتصادی اور معاشی حالت پہلے سے زیادہ ناہموار ہو رہی ہے۔ اور دلوں کا سکون بالکل رخصت ہو چکا ہے۔ اسکی وجہ بجز اسکے اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ تنظیمیں جن اُصول و تصورات کی بنیادوں پر اٹھائی گئی تھیں، ان کا فطری اور طبعی نتیجہ یہی ہو سکتا تھا، جو آج ہمارے سامنے ہے۔ زمین میں جھاڑ کا درخت لگا کر آپ کیسے

توقع رکھ سکتے ہیں کہ یہ آم کا پھل لائیگا۔ کانٹوں کی فصل بو کر آپ پھولوں کی بہار کا تماشا کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ گندے نالوں میں ناکارہ اور نہایت گھٹیا قسم کی گھاس پھونس ہی اگ سکتی ہے۔ جس سے مخلوق خدا کو بجائے فائدہ کے نقصان ہی پہنچتا ہے۔

البلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا۔ (الاعراف)

پاکیزہ زمین ہے خدا کے حکم سے سبزہ اگتا ہے۔ اور جو ناپاک زمین ہے اس سے بجز ناقص اور ناکارہ چیزوں کے اور کیا اگ سکتا ہے؟

اگر جماعتی تنظیم کو صحیح اور صالح اصول و تصورات کی اساس پر کھڑا کیا جاتا تو آج امن و خوش حالی، سکون قلب، معاشی توازن، جذبۂ اخوت اور مساوات عامہ کی ضیا باریوں سے زمین کا چپہ چپہ چمک اٹھتا۔ نغمہ ہائے مسرت سے فضا گونج اٹھتی اور ہر شخص آزادی و حریت کے ثمرات سے متمتع ہوتا کیونکہ ان اصولوں کا طبعی نتیجہ ہی یہ ہے۔

مَثَلُ كَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا (ابراہیم)

پاکیزہ کلمہ کی مثال اس پاکیزہ درخت کی سی ہے جسکی جڑیں زمین میں مضبوطی سے گڑی ہوئی ہوں اور شاخیں بلندی میں لہرا رہی ہوں اور وہ اپنے رب کے حکم سے ہر موسم میں پھل لاتا ہو۔

ان حقائق کے پیش نظر مستقبل کی تعمیر معاشرہ میں ذہنی انقلاب پیدا

کرنے اور نظام اسلامی کی عملی تشکیل کا کام صرف اسی جماعت کے ذریعہ سے تکمیل پذیر ہو سکتا ہے جو قرآن حکیم کے اخلاقی تصورات کی بنیادوں پر منظم ہو۔

تعمیری کام کی نوعیت

اب سوال یہ ہے کہ آج کے جدید حالات میں کام کی نوعیت کیا ہوگی؟

سطور بالا میں قوم کا ذہنی اور فکری حیثیت سے تجزیہ کیا جا چکا ہے ان طبقوں کی اصلاح و تعمیر کے لئے آج ایسے تعمیری لائحہ عمل کی ضرورت ہے جو ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہو۔ یعنی آج کی دنیا میں جاہلیت قدیمہ اور جاہلیت حدیثہ نے اسلام کے خلاف جتنے محاذ بنا رکھے ہیں۔ صالحین کی اس جماعت کو ان تمام محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ جہاں پرانے ہتھیاروں کی ضرورت ہے، وہاں پرانے ہتھیاروں کو کام میں لایا جائیگا۔ اور جہاں جدید اسلحہ کی ضرورت ہے، وہاں جدید اسلحہ استعمال کئے جائینگے لیکن اگر اس بات کی کوشش کی جائے کہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے پرانے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر زمانہ حال کے جدید آلات حرب کا مقابلہ کیا جائے تو یہ کوشش یقیناً ناکام رہیگی۔ مثلاً دور عباسیہ میں فتنۂ اعتزال کے خلاف جو علمی اور استدلالی جدوجہد کی گئی تھی وہ اس زمانہ کے لحاظ سے یقیناً کامیاب کوشش تھی۔ لیکن آج جدید اعتزال کے مقابلہ میں نئی حرکت علمیہ کی ضرورت ہے۔ جو کتاب و سنت کے اصول موضوعہ اور قوانین کلیہ سے ماخوذ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم آج ماضی کی

علمی، اصلاحی، اور تعمیری کوششوں سے بالکل بے نیاز ہو جائیں۔ اور اپنی قومی و ملی روایات کو یکسر نظر انداز کر دیں۔ قوم کی اجتماعی زندگی کے تاریخی تسلسل کو برقرار رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ عصر حاضر کے جدید تقاضوں اور نئے تغیرات کے ساتھ ساتھ زندگی کو تبدیل کرنا ناگزیر ہے۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی حدود میں بالکل درست ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو اگر حد اعتدال سے بڑھا دیا جائے تو اس سے بیشمار قومی و ملی مفاسد رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر قومی سیرت اور اجتماعی زندگی کے بنیادی اور اصولی تسلسل کو منقطع کر دیا جائے تو یہ قوم اپنے تشخص ملی سے محروم ہو جائیگی۔ اور پھر ہر قوم اسکو آسانی سے اپنے اندر جذب کر سکے گی۔ اور اگر جدت آفرینی اور سعی اجتہاد سے بالکل پہلوتہی کر لیا جائے، اسلاف کے کارناموں کو غیر متغیر اور غیر متبدل سمجھ کر محض ان پر ہی قناعت کر لی جائے۔ اور زمانہ کی نئی ضرورتوں کے مطابق اپنے اندر نیا تغیر پیدا کرنے کو گناہ تصور کر لیا جائے تو قوم ایک لاشۂ بے جان یا "قشر بے مغز" بن کے رہ جائے گی جس کو زمانہ کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہا لے جائیگا۔ کیونکہ جو قوم وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ نہ ہو سکتی ہو، قدرت اسکو "بقاء اصلح" یا "بقاء انفع" کے ہمہ گیر اصول کے تحت ہرگز زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی۔ زمانہ ہر چیز سے حسن و موزونیت اور قوت و صحت کام کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو اسکے مطالبہ کو پورا کرنے کے لئے مستعد رہتا ہے، اسکو وہ بہار زندگی سے ہمکنار کرتا ہے اور جو اسکے مطالبہ سے پہلوتہی

کرتا ہے۔ اسکو وہ آغوش عدم میں سلا دیتا ہے۔

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا۔ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِى النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ۔

(الرعد)

خدا نے آسمان سے پانی اتارا پس اپنے اپنے اندازہ سے نالے بہنے لگے۔ پس سیلاب نے اُبھرے ہوئے جھاگ اٹھالئے۔ اور اُس چیز سے جسکو (کٹھالی میں رکھ کر) آگ پہ زیور بنانے کے لئے جلاتے ہیں، سے بھی ایسے ہی جھاگ اُٹھتے ہیں، اللہ تعالیٰ حق و باطل کی اس طرح مثال بیان کرتا ہے۔ پس جھاگ خشک ہوکر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور جو چیز لوگوں کو نفع پہنچانے والی ہے۔ وہ زمین میں باقی رہ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسی ہی مثالیں بیان کرتا ہے۔

بہرحال تعمیری جد و جہد کی راہ میں جدید علمی کاوشوں کے ساتھ ساتھ ماضی کے علمی اور تعمیری کارناموں سے بھی استفادہ کرنا پڑے گا۔ مثلاً زمانۂ حال کے غلط کار اہل خانقاہ اور اہل مدرسہ جو ہر اصلاحی کوشش کے دشمن اور ہر تعمیری جد و جہد کی راہ میں شدید رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ (ان کے مرض کی) نوعیت آج بھی قریب قریب وہی ہے جو آج سے کئی صدی پہلے تھی علی ہذا، عامتہ المسلمین کے معاشرتی، اخلاقی، تمدنی اور اجتماعی مفاسد ایک حد تک دور ماضی سے ملتے جلتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی اصلاح کے لئے آج بھی

علاّمہ ابن تیمیہؒ، مجدّد الف ثانیؒ اور امام ولی اللہؒ کے علمی اور تعمیری کارناموں سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ اول الذکر طبقوں کی اصلاح کے توسط سے اور براہ راست عوام میں اخلاقی اثر و نفوذ پیدا کرنے سے یہ جدید جماعتی تنظیم ایک موثر طاقت بن سکتی ہے۔

مغرب کی نشاۃ جدیدہ نے سیاست و معیشت کے نئے نئے نظریے (تھیوریز) پیدا کر دیئے ہیں۔ اور قوم کا ایک بڑا طبقہ ان جدید تصورات سیاست و معیشت سے بشدید طور پر متاثر ہے۔ اور دور حاضر میں جو جماعت اخلاقی بنیادوں پر معاشرہ میں جدید انقلاب بپا کرنے کے لئے اٹھیگی اسکو بہرحال کتاب وسنت کے اصول عامہ کی روشنی میں ان مسائل کا سائنٹیفک حل تلاش کرنا پڑے گا۔ یہی وہ اہم کام ہے۔ جس سے جاہلیت جدیدہ کے جارحانہ اقدام کو روکا جا سکتا ہے۔ اور جو لوگ اسکے زیر اثر ہیں، ان کو قریب لایا جا سکتا ہے۔

اس کام میں اگرچہ جدید علمی کاوش کی ضرورت ہے۔ مگر ماضی کے علماء و مفکرین کے افکار و خیالات سے استفادہ کئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ مثلاً اجتماعی سیاسیات و معاشیات کے موضوع پر ابن عبید کی کتاب الاموال، قاضی ماوردی کی "الاحکام السلطانیہ" ابن قیم کی طرق الحکمۃ و اعلام الموقعین، امام ابو یوسف کی کتاب الخراج، شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیاست و معیشت، اور علامہ اقبال کا فلسفۂ تمدن بڑی حد تک ہماری جدید حرکت علمیہ میں معاون بن سکتا ہے۔

اس موقع پر ایک دوسری حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ اُصولی جماعت جس نے پوری قوم کو زندگی کے مقدس اور بلند تر نصب العین سے روشناس کرنا۔ اور پھر اس میں اس نصب العین کے لئے سچی تڑپ اور گہری لگن پیدا کرنا ہے۔ اسکو ہر طرح کی سیاسی طبقاتی اور گروہی عصبیت سے بالاتر ہونا چاہئے تاکہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں اپنا کام جاری رکھ سکے۔ اسکے برعکس اگر وہ موجودہ عملی سیاست میں حصہ لیگی یا کسی خاص مذہبی طبقہ سے اپنے کو منسوب کرے گی تو وہ دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح ایک سیاسی پارٹی یا دوسرے مذہبی گروہوں کی طرح ایک مذہبی گروہ بن کے رہ جائیگی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکی دعوت بالکل بے اثر اور محدود ہو جائیگی۔ لہذا اس جماعت کو اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر فروعی اور وقتی مسائل میں الجھنا نہیں چاہئے۔ اور اس کا حقیقی کام صرف اتنا ہے کہ وہ معاشرہ کے دل و دماغ میں اُتر جائے اور اسکے فکر و ذہن کو تبدیل کر کے رائے عامہ کو ہموار بنا دے۔ یہ کام یقیناً وقت اور محنت کا طالب ہے۔ لیکن اس میں جتنا عرصہ اور جتنی محنت صرف ہوگی۔ نتائج بھی اتنے ہی شاندار ہوں گے۔ یعنی اس مقدس جدوجہد کے نقوش قوم کی حیات اجتماعیہ میں جس قدر گہرے ہوتے جائیں گے، اتنا ہی سیاسی و معاشی انقلاب کا وقت قریب تر ہوتا جائیگا۔ اور جاہلی اقتدار کی گرفت ڈھیلی ہوتی جائیگی۔ اور بالآخر بغیر کسی شدید مزاحمت کے کامل سیاسی انقلاب برپا کیا جا سکے گا۔

وسائلِ کار سطور بالا میں قوم کے جن طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی ذہنی تربیت الگ الگ ماحول میں ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے انکی زندگی کے نقطہ ہائے نظر بھی جُدا جُدا ہیں۔ مشائخ و صوفیا کی جماعت کے افکار و تصورات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ محسوس ہوگا، کہ انکی دنیا ہی دوسرے لوگوں سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ تسبیح خوانی اور ذکر و مراقبہ کے سوا ان کا کوئی مشغلہ نہیں ہے۔ اور جو لوگ انکی طرح عزلت گزینی کی زندگی بسر نہیں کرتے وہ انکی نظر میں دنیا پرست اور مردار خور ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ انکی معیشت کا دار و مدار ان مردار خوروں ہی کے نذرانوں پر ہے۔ اور اس سے ہم یہ بات سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ ان لوگوں نے زندگی کی بلا خیز کشاکش سے تنگ آکر گوشہ نشینی کی راہ اختیار کی ہے۔

زاہد نہ داشت تابِ جمالِ پری رُخاں
کُنجے گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت

علمائے مدرسہ کی فضا میں پرورش پائی ہے۔ زندگی کے نئے تقاضوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ آج سے کئی سو سال پہلے کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ان کا رجحانِ فکر دوسرے طبقوں سے بالکل ہی نرالا ہے۔ اور بحث و مناظرہ اور قیل و قال ان کی زندگی کا معمول ہے۔

جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ذہنی ساخت میں لادینی علوم و افکار کا عنصر غالب ہے۔ اور اسلام کے ساتھ بھی ان کا رسمی تعلق قائم ہے اس دو گونہ تعلق نے ان کے ذہن کو عجیب و غریب مجموعۂ اضداد بنا دیا ہے۔

یہ لوگ جب کسی مسئلے پر سوچنے لگتے ہیں تو ان کی حرکتِ فکر کی ابتدا اہلِ مغرب کے مادی افکار و تصورات سے ہوتی ہے۔ اور آگے چل کر جب ان کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس دامن گیر ہوتا ہے۔ تو کسی سُنی سنائی آیت کو توڑ مروڑ کر اپنے خیال کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ ذہنی تضاد حد درجہ مضحکہ خیز اور ملت اسلامیہ کی وحدتِ فکر کے لئے زہر قاتل ہے۔

عامۃ المسلمین ہمیشہ سے اہلِ اقتدار اور علماء و مشائخ کے زیر اثر رہے ہیں۔ اور آج بھی ان کا یہی حال ہے۔ یہ لوگ خود دینی اور ملی شعور سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اور چالاک لوگ ان کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح آگے لگا لیتے ہیں۔ مگر ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، وہ عوام کی پریشانی خیال اور انتشار ذہن کا بحرانی دور ہے۔ ماضی اور حال کی اجتماعی تحریکوں نے ان میں مایوسی کی لہر دوڑا دی ہے۔ اور سیاسی جماعتوں کے بے حقیقت دعاوی، غرض پرستانہ عزائم اور مکارانہ طرز سیاست سے یہ لوگ اس قدر بدظن ہو چکے ہیں کہ اب وہ کسی مخلص اور صالح جماعت پر بھی مشکل ہی سے اعتماد کر سکتے ہیں۔

ان چار طبقوں میں سے ہر ایک طبقہ بیسیوں گروہوں میں منقسم ہے اور ہر گروہ کا اندازِ فکر دوسروں سے بالکل ہی جدا ہے۔ مگر اتنی بات سب میں مشترک ہے کہ ان کی ذہنی تربیت صحیح دینی تصورات کی بنیادوں پر نہیں ہوئی۔ اور غیر اسلامی افکار و تصورات ان کے دل و دماغ میں اس طرح

راسخ ہو چکے ہیں کہ اب ان میں خالص دینی تحریک کی مقبولیت مشکل ہے
یہ صحیح ہے کہ ہر گروہ میں کچھ پاکیزہ فطرت اور مستعد لوگ موجود ہیں جو ا
دینی دعوت کو بخوشی قبول کرینگے۔ مگر بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جن
فطرت سلیمہ مسخ ہو چکی ہے۔ اور وہ نہ صرف اس دعوت سے اعراض کر
بلکہ اپنے شخصی قبیلوں اور جماعتی مفاد کی خاطر اس کی مخالفت میں
تمام قوتیں لڑا دینگے۔

ان حالات میں دینی دعوت کا انحصار بڑی حد تک قوم کی نئی
کی ذہنی تربیت پر ہے۔ اور درحقیقت موجودہ فکری لامرکزیت،
مقصدی انتشار کو ختم کرنے کا اسکے سوا کوئی طریق کار نہیں ہے۔ ا
وہ اہم کام ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ صرف کرنا پڑے گی۔ مگر یہ حقیقت
ہے کہ یہ کام جتنا اہم ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ یعنی اس مقصد کی راہ
کئی منزلیں ہیں۔ اور ہر منزل بجائے خود ایک نہایت شدید اور کٹھن
جس کو سر کرنے میں تمام علمی اور عملی قوتوں کو حرکت میں لانا پڑیگا۔

اس بات کو کسی حال میں بھولنا نہیں چاہیئے کہ جب تک زندگی
اور مستقل اقدار کے زیر اثر انسانی ذہن کی از سر نو تعمیر نہ ہوگی۔ اور
ہمہ گیر ذہنی لامرکزیت اور فکری پراگندگی کو ختم کرنے کے بعد فکر و ذہن میں
ربط و نظم پیدا نہ ہوگا، اسوقت تک انسانی کوشش کسی سہ
مسئلہ زندگی کو بھی حل کرنے میں کامیاب نہ ہوگی۔ اسلئے سب سے پہلا
کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ ذہنی انتشار کو ختم کر کے فکر و خیال

وتسلسل پیدا کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی پہلی منزل یہ ہے کہ ایک جدید مکتب فکر (سکول آف تھاٹ) کی طرح ڈالی جائے۔ یہ مکتب خیال خدا پرستی کے تصور اور خیر و شر کی حقیقی قدروں کی اساس پر جدید اسلامی فلسفۂ زندگی کی تشکیل کرے۔ اسلامی عقائد و اعمال کی سائنٹیفک توجیہات سے ایک مربوط اور منظم نظام فکر ترتیب دے۔ یعنی اسلام کی حقیقی روح اور دین کے اصل منشا کو سمجھنے کے بعد الٰہیات، طبعیات، سیاست ومعیشت اور عبادات و معاملات کے قرآنی تصورات کی اس رنگ میں توجیہہ کی جائے کہ عصر حاضر کے عقل پرست انسان کو (بشرطیکہ وہ دیانت وسنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ ہو) قرآنی فلسفۂ زندگی کی ہمہ گیر افادیت کا یقین ہو جائے۔ اور وہ خود ہی محسوس کرنے لگے کہ دنیا میں امن وسلامتی کی راہ صرف اسلام ہی کی راہ ہے۔ اور پھر ان تصورات کو اس طرح مرتب اور منظم شکل میں پیش کیا جائے کہ ہر تصور اپنے صحیح مقام پر فٹ آجائے۔ ابدی اور ابتدا سے انتہا تک اسلام کی حقیقی روح اس میں جاری وساری رس ہو۔

میں یہ کام اتنا مشکل ہے کہ موجودہ حالات میں اسکے تصور ہی سے دل ین پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر ایسے کام کی ابتدا ہمیشہ نامساعد ہو کام ور مایوس کن حالات میں ہوتی ہے۔ اور جب عزم صمیم کے ساتھ کام کا آغاز ربہ ہو جاتا ہے تو تدریجاً یاس و نومیدی کے بادل چھٹتے چلے جاتے ہیں۔ اور وز و کامیابی کی عالمتاب شعاعیں ضیا بار ہونے لگتی ہیں۔ اور پھر پہلی مرتبہ

ہی کام کے تمام تکمیلی مراحل طے نہیں ہو جایا کرتے بلکہ ابتدائی مرحلہ پر اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ نئے کام کی ایک مثال قائم کر دی جائے۔ اسکے بعد ذہنی نقشہ کے مطابق یہ فقرہ مکرر ہے اس جدید علمی حرکت کو جاری رکھا جائے۔ اور اس نقشہ میں جو خانے خالی رہ گئے ہوں انکو تدریجاً پُر کرنے کی سعی کی جائے۔

کام کی دوسری منزل یہ ہے کہ اس نظامِ فکر کی بنیادوں پر ایک تفصیلی نصاب تعلیم مرتب کیا جائے۔ جس کے تمام شعبے بنیادی فکر اور غایت و مقصد کے لحاظ سے باہم مربوط ہوں۔ اس نظام تعلیم کی ترتیب میں اس امر کو ملحوظ رکھا جائے کہ اسکی ہر کڑی اپنی صحیح جگہ پر جڑی ہوئی ہو۔ اور وہ اپنی طبعی ساخت و ترکیب سے انسانی فکر میں ربط و نظم پیدا کر سکتا ہو۔

آج ممالک اسلامیہ میں دو قسم کے تعلیمی مراکز پائے جاتے ہیں — دینی درسگاہیں۔ اور جدید علوم کے کالج اور یونیورسٹیاں۔ اول الذکر درسگاہوں میں جو نظام تعلیم رائج ہے۔ وہ آج سے آٹھ سو سال پہلے کے علماء و مجتہدین کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے، یہ کارنامے اُس دور کے لئے یقیناً موزوں اور کارآمد ہونگے۔ لیکن آج علمی دنیا میں حیرت انگیز انقلاب رونما ہو چکا ہے۔ اور بے شمار علمی، معاشی، سیاسی اور عمرانی مسائل ہیں جو قرآنی بصیرت اور مجتہدانہ نظر کے بغیر ہرگز حل نہیں ہو سکتے۔ مگر ہمارے علماء کی حالت یہ ہے کہ ان کے نزدیک کئی صدی پہلے کے مفسرین اور علماء متفکرین کے اقوال و افکار کو ازبر کر لینا ہی منتہائے کمال ہے۔ اور قر

میں خود غور و فکر کرنا ان کے نزدیک گناہِ عظیم بلکہ کفر ہے۔ نیز مروجہ دینی نظام تعلیم کسی مربوط نظام فکر اور متعین مقصد پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ چند بے جوڑ اور بے ربط علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ جس سے قدرتی طور پر ذہن میں ربط و تنظیم نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اور زیادہ الجھاؤ پیدا کرتا ہے۔

یہ تو دینی درسگاہوں کی حالت ہے۔ اور دنیوی درسگاہ کا بنیادی مقصد ہی ایسے لوگ پیدا کرنا ہے جو حکومت کی مشینری میں پرزوں کا کام دے سکیں۔ ظاہر ہے کہ جس نظام تعلیم کی غرض و غایت ہی محض پیٹ پوجا ہو اس سے فکر و ذہن کی اصلاح و تنظیم کی توقع رکھنا سراسر غلط ہے۔

اس بنا پر آج ضرورت ہے کہ آئندہ نسلوں کے لئے جو جدید نظام تعلیم مرتب کیا جائے، وہ دین کے بنیادی تصور اور مقصد حیات کے اعتبار سے اس طرح مربوط ہو کہ اسکے پڑھنے والوں میں ابتدا ہی سے مقصد کا شعور پیدا ہونے لگے۔ اور جوں جوں وہ آگے بڑھتے جائیں اسی قدر یہ مقصدی شعور تیز تر ہوتا جائے۔ کتاب و سنت۔ فلسفۂ طبیعی، اور ما بعد الطبیعی، علم قانون، علم الاخلاق، علم العمران اور دیگر تمام علوم و فنون میں ایک ہی روح کارفرما ہو۔ نیز یہ نصاب تعلیم ہر لحاظ سے ہمہ گیر اور مکمل ہو اور اس میں دینی اور دنیوی کی کوئی تفریق نہ ہو۔

یہ کام بھی پہلے کام کی طرح از حد مشکل ہے۔ لیکن ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ کسی ایسے کام کو جس پر نسل انسانی کی فلاح و نجات کا انحصار ہو محض اسکے اشکال کی وجہ سے چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اور دنیا میں وہ کون سا

مشکل کام ہے جس کو حل کرنے میں انسان کا آہنی عزم ناکام رہ گیا ہو۔ آج مستقبل کی تعمیر جدید کے لئے جس مقدس جماعت سے خدائے قدوس کام لینے والے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے مشکل ترین کام کو آسان تر بنا دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

کام کی تیسری منزل ایک ایسی مرکزی تعلیمی درسگاہ کا قیام ہے جہاں سب سے پہلے اس جدید نظام تعلیم کا عملی تجربہ کیا جائے اور وہاں ایسے باکمال معلم اور مبلغ تیار کئے جائیں جو ملک کے ہر حصّہ میں اس طرز کے تعلیمی مشن کو رواج دیں۔ اور ہر شہر و قصبہ میں اس جدید نصاب تعلیم کی درسگاہیں کھل جائیں۔ اس طرح سے چند سالوں میں ہماری نئی نسلوں میں ذہنی اور فکری وحدت و ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی۔ اور موجودہ ذہنی انتشار ختم ہو جائے گا۔

وَبِاللّٰہِ التَّوفِیق۔

سلسلہ مطبوعات نمبر ۸۲

تعمیری انقلاب

اور

قرآنی اصولِ حکمت

از:-

حیدر زماں صدیقی

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور